www.urducouncil.nic.in
قیمت: -/15 ₹

آدھی آبادی کے جذبات واحساسات کا ترجمان

ماہنامہ

خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

نومبر 2024

نوبل انعام یافتہ خواتین

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ

بچوں کی دنیا

دہلی

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
دلچسپ کہانیاں
سائنس و ٹیکنالوجی

معلوماتی مضامین
صحت اطفال
تاریخی، سائنسی و ثقافتی معلومات

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ زبان شناسی

بچوں کی پینٹنگ ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

سب سے زیادہ چھپنے والا بچوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 15 روپے   سالانہ: 145 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرِتعاون سالانہ 145 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: magazines@ncpul.in

شاخ: 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

آدھی آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان
ماہنامہ
خواتین دنیا
Mahnama Khawateen Duniya Monthly, New Delhi

جلد: 8 شمارہ: 11 نومبر 2024

مدیر اعلیٰ : ڈاکٹر شمس اقبال
مدیر منتظم : ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی
نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالباری

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان
وزارت تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند
مطبع: میکاف پرنٹرس، B-127، سیکٹر 65
نوئیڈا۔ 201301 (یوپی)
مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل
قیمت -/15 روپے، سالانہ -/145 روپے
صفحات: Total Pages 64

■ قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
● ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا
جسولہ، نئی دہلی-110025، فون: 49539000
نگارشات ارسال کرنے کے لیے
ای میل: kduniya@ncpul.in
editor@ncpul.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی۔ 110066
فون: 26109746، فیکس: 26108159
ای میل: sales@ncpul.in
شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002
فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

اداریہ

مشعل — مدیر — 4

کور اسٹوری

نوبل انعام یافتہ خواتین — سید محمد ثاقب فریدی — 5

شخصیت

صغرا ہمایوں مرزا کی ادبی و سماجی خدمات — حمیرہ سعید — 12

نکہت سخن

شاعرات کے منتخب اشعار — 15

جہان نسواں

لل دید کی شاعری اور فلسفۂ حیات — ڈاکٹر راکیش کمار — 16
ناولٹ 'چائے کے باغ' ایک جائزہ — ڈاکٹر سیدہ انجم آرا — 20
حسین الحق: حیات و خدمات — ہما — 23
سائنسی و تکنیکی ترقیات، تہذیبی انحطاط اور معاصر اردو غزل — ثنا — 27

خواتین اور تعلیم

تعلیمی ترقی — صغرا مہدی — 32
کشمیر میں تعلیم نسواں کی علمبردار بیگم ظفر علی — ڈاکٹر محمد افروز عالم — 36
نعیمہ خاتون: طالبات کے لیے مشعل راہ — صدف صہیب خان — 39

حسن سخن

ہاجرہ نور زریاب، نوشین تبسم، ذاکرہ شبنم، عقبیٰ حمید، زبیدہ شکیل — 41

افسانہ

پس پردہ — آیت تنویر — 45
وجدان — فہیمہ مقصود خان — 48
برقع اٹھتے ہی چاند سا نکلا — صائمہ پروین — 51

صحت

بیماریوں سے تحفظ — ستیہ گپتا — 57

ارتباط

قارئین کے خطوط — 61

مشعل

موجودہ عہد میں خواتین مردوں کے ساتھ ساتھ ترقی کے منازل طے کر رہی ہیں۔ علمی اور ادبی سطح پر انھوں نے جس طرح اپنی ایک نئی اور انفرادی شناخت قائم کی ہے وہ ایک واقعہ ہے۔ وہ قائدانہ عہدوں پر بھی فائز ہو رہی ہیں اور زندگی کے مختلف شعبوں میں ان کی شمولیت تیزی کے ساتھ بڑھ رہی ہے۔ وہ نہ صرف گھر کی ذمے داریوں کو حسن وخوبی کے ساتھ مکمل کرنے میں کامیاب ہیں بلکہ گھر سے باہر اسکولوں، کالجوں اور مختلف یونیورسیٹیوں میں بھی زندگی کے اہم فرائض خوبصورتی کے ساتھ انجام دے رہی ہیں۔ آج کی زندگی خواتین کے فکر وخیال اور وژن سے نہ صرف مستفیض ہو رہی ہے بلکہ ان کی نمائندگی اور شمولیت کے بغیر ایک کامیاب زندگی کا تصور ممکن نہیں۔

ان دنوں بین الاقوامی سطح پر خواتین کی نمائندگی دیکھی جا رہی ہے۔ کچھ دنوں قبل جنوبی کوریا کی ایک اہم ناولسٹ ہان کانگ کو 2024 کا نوبل انعام دیا گیا ہے۔ یہ نوبل انعام ان کے ناول ''ویجی ٹیرین'' پر دیا گیا ہے۔ ناول لکھنے والی ادیبہ بھی ایک خاتون ہیں اور اس کا مرکزی کردار بھی ایک خاتون ہے۔ ناول کے اس مرکزی کردار نے پوری دنیا کے ذہن پر ایک گہرا نقش بنایا ہے اور اپنے زمانے کے جذبے اور احساس کو گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے۔ اس سے قبل 2022 میں بھی اینی ارناکس کو ادب میں نوبل انعام ملا تھا۔ مردوں کے مقابلے خواتین کو بہت کم نوبل انعامات دیے گئے لیکن یہ بات خوش آئند ہے کہ اب نوبل انعام یافتگان میں بتدریج خواتین کی شمولیت بڑھ رہی ہے۔ خاص طور سے 2013 سے اب تک ادب کے زمرے میں چھ خواتین کو نوبل انعام دیا گیا ہے۔ ہان کانگ کو جب نوبل انعام دیا گیا تو دنیا نے جانا کہ کس طرح انھوں نے علاقائی افکار واقدار اور روایت ورسومات کو اپنی فنی ہنرمندی سے آفاقی بنا دیا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ پوری دنیا میں ان خواتین پر توجہ مرکوز کی جائے جو زندگی کے مختلف میدانوں میں غیر معمولی خدمات انجام دے رہی ہیں۔ تاکہ لوگوں کو ان کے خیالات وافکار سے استفادے کا موقع مل سکے۔

بھارتیہ حکومت بھی خواتین کو بااختیار بنانے کے لیے کوشاں ہے اور اس سمت میں مستقل اقدام کر رہی ہے۔ بھارت سرکار نے ناری شکتی کے ذریعے زندگی کے مختلف شعبوں میں خواتین کی نمائندگی اور شمولیت کو لازمی اور حتمی بنایا ہے۔ حکومت یہ چاہتی ہے کہ خواتین کی نمائندگی میں مزید اضافہ ہو۔ یہی سبب ہے کہ سرکار اسمبلی سے لے کر لوک سبھا تک خواتین کی نمائندگی میں اضافے کی خواہشمند ہے۔ خواتین کو بااختیار بنانے کے لیے بھارت سرکار کی جانب سے بہت سارے پروگرام منعقد کیے جا رہے ہیں۔ ناری شکتی وندن ایکٹ خواتین کے خوابوں کی تعبیر ہے اور ان کے حقوق واحترام کی تکمیل کا ایک اہم وسیلہ ہے۔ حکومت کے مختلف اداروں میں بھی خواتین کی نمائندگی بتدریج بڑھ رہی ہے۔

قومی کونسل کی تمام علمی وادبی سرگرمیوں میں بھی خواتین کی نمائندگی دیکھی جا سکتی ہے۔ کونسل سے شائع ہونے والے تمام رسالوں میں خواتین کی نمائندگی کو یقینی بنایا گیا ہے۔ قومی کونسل کے پلیٹ فارم سے ''ماہنامہ خواتین دنیا'' بھی دراصل انھی کوششوں کی توسیع ہے۔ قومی کونسل چاہتی ہے کہ خواتین کی زندگی کے اہم اور مختلف النوع مسائل پر مضامین شائع کیے جائیں۔ نہ صرف ادب بلکہ زندگی کے مختلف شعبوں میں خواتین کی شمولیت کو موضوع گفتگو بنایا جائے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ آپ حضرات اس حوالے سے آگے آئیں اور ہمارے قدم سے قدم ملا کر کھڑے ہوں۔

آپ کا

شمس اقبال

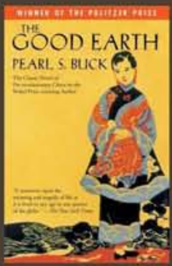

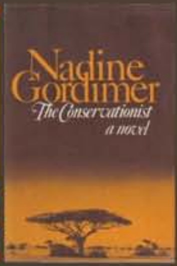

سید محمد ثاقب فریدی

نوبل انعام یافتہ خواتین

ادب کے حوالے سے

سب سے پہلے پولینڈ کی سائنسداں میری کیوری کو نوبل انعام دیا گیاتھا۔اسی زمانے میں اکسرے آیاتھااور میری کیوری اس کی تفہیم اور ریسرچ کے لیے بہت منہمک تھیں ۔ میری کیوری نے اپنے شوہر کے ساتھ مل کر تیز شعائیں دریافت کی تھیں اور انھیں ریڈیو ایکٹوٹی کانام دیا۔ ان دونوں کومشترکہ طورپر 1903میں، نوبل انعام دیا گیا۔ میری کیوری کو دوسری مرتبہ ریڈیم دریافت کرنے کے لیے نوبل انعام دیا گیا۔

نوبل انعام سویڈن کے مشہور بزنس مین الفریڈ نوبل کے نام پر دیا جاتا ہے۔الفریڈ نوبل معروف سائنس داں ہیں، جنھوں نے ڈائنامائٹ ایجاد کیا۔نوبل انعام کمسٹری، فزکس، طب، ادب، امن کے شعبوں میں دیا جاتا ہے۔1968 میں اکنامکس کا بھی اضافہ کیا گیا تھا۔ نوبل انعام دینے کے لیے یہ دیکھا جاتا ہے کہ گذشتہ بارہ مہینوں میں کن افراد نے عالم انسانیت کو اپنی غیر معمولی کوششوں سے فائدہ پہنچایا ہے۔ یونیورسٹیوں کے اساتذہ، سائنسداں، ماہرین تعلیم اور سابق نوبل انعام یافتگان نوبل انعام دینے کے لیے کس کو نامزد کرتے ہیں۔ کسی ایک شعبے میں بھی کئی افراد کو نوبل انعام مل سکتا ہے۔ اگر کسی سال کسی شعبے میں کوئی انعام کا مستحق نہ ہو تو انعام کسی کو بھی نہیں دیا جاتا۔ نوبل انعام سویڈن کے معروف شہر 'سٹاک ہوم' میں دیے جاتے ہیں۔ جبکہ امن کا نوبل انعام اوسلو میں دیا جاتا ہے۔نوبل انعام میں انعام یافتگان کو تین چیزیں دی جاتی ہیں۔ 1- نوبل ڈپلوما: یہ نایاب فن پارے ہوا کرتے ہیں۔ 2- نوبل میڈل: ان کے الگ الگ ڈیزائن ہوا کرتے ہیں۔ 3- ایک کروڑ سویڈش کرونا جس کی مقدار فی الوقت 947762 امریکی ڈالر ہے۔ بھارتیہ کرنسی کے مطابق یہ رقم 7,96,63,200 روپے ہوتی ہے۔انعام کی رقم حاصل کرنے کے لیے انعام یافتگان کے لیے خطبہ دینا لازمی ہے۔

1901 سے 2024 تک 976 افراد اور 28 اداروں کو نوبل انعام دیا جا چکا ہے۔ 976 افراد میں صرف 65 خواتین ہیں جنھیں نوبل انعام ملا۔ یہ بات گفتگو کا موضوع رہی ہے کہ مردوں کے مقابلے خواتین کو کیوں اس قدر کم نوبل انعامات ملے ۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ

انعام دینے والی کمیٹیوں میں خواتین کی تعداد بہت کم ہے۔ناروے کمیٹی کی سیکریٹری نے یہ بات کہی ہے کہ اگر نوبل انعام کی انتخابی کمیٹیوں میں خواتین ممبروں کی تعداد بڑھادی جائے تو نوبل انعام یافتہ خواتین کی تعداد میں بھی اضافہ ممکن ہے۔فزکس کی انتخابی کمیٹی کی رکن ایوا آلسن نے اے ایف پی سے کہا کہ نوبل انعام دینے والی کمیٹیوں میں خواتین کی نمائندگی بہت کم ہے۔ اگر اس نمائندگی میں اضافہ ہوتو پھر طالبات ان سے متاثر ہوکر فزکس کے شعبے کی طرف متوجہ ہوں گی ۔

سب سے پہلے پولینڈ کی سائنسداں میری کیوری کو نوبل انعام دیا گیا تھا۔اسی زمانے میں ایکسرے آیا تھا اور میری کیوری اس کی تفہیم اور ریسرچ کے لیے بہت منہمک تھیں ۔ میری کیوری نے اپنے شوہر کے ساتھ مل کر تیز شعاعیں دریافت کی تھیں اور انہیں ریڈیو ایکٹوٹی کا نام دیا۔ ان دونوں کو مشترکہ طور پر 1903 میں،نوبل انعام دیا گیا۔میری کیوری کو دوسری مرتبہ ریڈیم دریافت کرنے کے لیے نوبل انعام دیا گیا۔

1858-1940

سویڈن کی selma Lagerlof سلما لاگرلف کو 1909 میں ان کے ناولوں اور افسانوں پر نوبل انعام دیا گیا۔وہ پہلی خاتون تھیں جنھیں زمرۂ ادب میں نوبل انعام ملا۔ جب ان کا پہلا ناول Gosta Berling's Saga 1981 میں شائع ہوا،اس وقت ان کی عمر 33 برس تھی۔انھیں بچپن سے ہی کہانیوں میں دلچسپی تھی ۔وہ کم عمری میں ہی شاعری کرنے لگی تھیں۔دیگر تخلیقات کے بالمقابل The Wonderful Adventures of Nils ان کی سب سے گراں قدر تخلیق ہے۔اس ناول سے ان کی شناخت قائم ہوئی ۔ان کا یہ ناول جادوئی حقیقت نگاری کی عمدہ مثال ہے۔اس کہانی میں مافوق الفطری عناصر اور اساطیر کوزندگی کی حقیقت کے طور پر دیکھا گیا ہے۔ان چیزوں نے سلما لاگرلف کے ناول کو مقبول بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔

1871-1936

اطالیہ کی Grazia Deledda گیزیہ ڈلیڈا کو 1926 میں نوبل انعام دیا گیا تھا۔ان کی تخلیقات زندگی کے مختلف تجربوں کا اظہار ہے۔ان کی تمام تخلیقات میں کسی نہ کسی طور پر ان کے وطن سارڈینیا کی تصویر دکھائی دیتی ہے۔ انھوں نے کم عمری میں از خود ادب کا مطالعہ شروع کیا۔مختصر ناول لکھے اور اس میں سارڈینیا کے کسانوں اور ان کے مختلف مسائل زندگی کو موضوع بنایا۔صرف 13 سال کی عمر میں ان کی پہلی کہانی ایک مقامی میگزین میں شائع ہوئی۔ان کے فکشن کا اصل موضوع غریبی و مفلسی اور اس کی تگ ودو ہے۔انھوں نے اپنی تخلیقات میں وطن کے افراد اور ریتی رواج کی بہت صاف وشفاف امیجری کی ہے۔اس موضوع میں تصور وخیال اور سوانحی عناصر شامل ہیں۔ان کا خیال ہے کہ فنکار کا تخلیقی عمل اس کی داخلی ضرورتوں کا اظہار ہے، اس کے بالمقابل قاری اور تخلیق کامیابی ثانوی حیثیت کی حامل ہیں۔ Flower of sardinia ان کا پہلا ناول ہے جو 1892 میں شائع ہوا۔اس میں انھوں نے انسانی کمزوریوں اور اخلاقی خرابیوں کو گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے۔ اس طور سے سارڈینیا انسانی کمزوریوں کا استعارہ بن گیا ہے۔

1882-1949

ناروے کی Sigrid Undset کو 1928 میں نوبل انعام دیا گیا۔انڈسیٹ کی پیدائش ڈنمارک میں ہوئی اور وہ ناروے میں پلی بڑھیں۔انھوں نے صرف سولہ سال کی عمر میں نارڈک قرون وسطی کے موضوع پر ایک تاریخی ناول لکھا۔دوسال بعد 1925 میں Fru Marta Oulie کے عنوان سے بدکاری کے موضوع پر ان کا دوسرا ناول شائع ہوا۔عصر حاضر ان کی گفتگو کا مرکز بنا اور انھوں نے کرسٹینیا کے متوسط طبقے کی ایک خاتون کا حقیقی کردار پیش کیا۔یہ ناول ان کی شناخت بن گیا اور انھیں بے پناہ شہرت حاصل ہوئی۔ انڈسیٹ نے 1919 تک عصری کرسٹینیا کے موضوع پر متعدد ناول تخلیق کیے اور کرسٹینیا شہر اور اس کے باشندوں کو موضوع گفتگو بنایا۔ان کے ناولوں میں کام کرنے والوں، معمولی تقدیر کے مارے غریبوں،بچوں اور والدین کے درمیان رشتوں کی کہانیاں ہیں۔ jenny 1911 اور Vaaren 1914 ان کے عہد حقیقت نگاری کے آخری ناول ہیں۔انڈسیٹ کے ان ناولوں نے انھیں تحریک آزادی نسواں سے الگ کردیا اور ان کی ایک علاحدہ شناخت قائم ہوئی۔

1892-1973

ریاستہائے متحدہ امریکا کی Pearl S. Buck کو 1938 میں نوبل انعام دیا گیا۔ان کے والدین کا تعلق عیسائی مشنری سے تھا۔ان کی زندگی بھی عیسائی مشنری کے

لیے وقف تھی۔عیسائی مشن کے تعلق سے انھوں نے زندگی کا ایک بڑا حصہ چین میں گزارا۔ان کا ناول The Good Earth امریکا میں 32-1931 کے دوران بیسٹ سیلر رہا۔1932 میں ان کے اس ناول کو Pulitzer انعام دیا گیا۔ پھر 1938 میں انھیں اسی ناول پر نوبل انعام ملا۔پرل کی زندگی کا المیہ یہ ہے کہ چینی اور یوروپی تہذیب مشترکہ طور پر ان کی تربیت کا حصہ تھی۔چین میں باکسر بغاوت کے بعد حالات بہت خراب ہو گئے تھے۔ان کے چینی دوستوں نے تعلقات ختم کر لیے اور یوروپی دوستوں نے آمد ورفت منقطع کر لی۔ –Fundamentalist Modernist controversy کے دوران ان کے خیالات تبدیل ہو گئے۔انھوں نے حقوق نسواں اور نسلی مساوات پر کھل کر لکھا۔چینی اور ایشیائی تہذیب کو بہت واضح طور پر پیش کیا۔خاص طور سے ایشیا اور مخلوط نسل پر تحریریں ان کی زندگی کا اہم حوالہ بن گئیں۔

1889-1957

چلی کی Gebriela Mistral کو شاعری پر 1945 میں نوبل انعام دیا گیا۔ ان کے گیتوں میں جذبے اور احساس کی غیر معمولی لہر شامل تھی۔اس سبب وہ لیٹن اور امریکن زندگی میں امنگوں اور آرزوؤں کا علامیہ بن گئیں ۔انھوں نے کم عمری میں شاعری کو اپنے داخلی اظہار کا وسیلہ بنالیا۔ریلوے میں کام کرنے والے ایک مزدور سے ان کی ملاقات ہوئی اور وہ اس کے عشق میں گرفتار ہوئیں لیکن دونوں کی شخصیت اور خیالات بہت مختلف تھے،اس لیے مسٹرال نے شادی نہیں کی۔غم میں ریلوے ملازم اُریٹا نے خودکشی کر لی۔اس بات نے مسٹرال کو داخلی سطح پر بہت مغموم کر دیا اور انھوں نے 1914 میں Sonnets on Death نظم لکھی۔ان کی اس کتاب کو national literary conteste میں پہلا انعام ملا۔ اس طرح اسپینش بولے جانے والے ممالک میں مسٹرال مشہور ہو گئیں۔مسٹرال نے اپنی دوسری کتاب 1922 Desolation میں اریٹا کی خودکشی کو غم واندوہ کا موضوع بنایا۔کولمبیا یونیورسیٹی سے یہ کتاب شائع ہوئی اور ساری دنیا میں ان کی شہرت ہوگئی۔مسٹرال کی تمام تخلیقات میں بچوں اور دلتوں کے تئیں غیر معمولی جذبات کی عکاسی ہے۔ان کی تحریروں میں ایک ماں کی ممتا بہت صاف وشفاف طور پر دکھائی دیتی ہے۔

سویڈن اور جرمنی کی Nelly Sachs کو 1966 میں نوبل انعام دیا گیا۔وہ سویڈش۔ جرمن شاعرہ اور ڈراما نگار تھیں۔انھوں نے شاعری بھی

1891-1970

کی اور اس کے ساتھ ڈرامے اور کہانیاں بھی لکھیں۔ جب وہ برلن سے سویڈن آ گئیں تو سویڈش زبان کا عمیق مطالعہ کیا اور سویڈش شاعروں کے ترجمے بھی کیے۔ یوروپ میں جب نازیوں کا عروج ہوا تو نیلی ساکس اپنے یہودی دوستوں کی جذباتی ترجمان بن گئیں ۔ان کی تخلیقات یہودیوں کے غموں اور آرزؤں کا اظہار بن گئیں۔ان کا سب سے بہترین اور کامیاب ڈراما Eli: Ein Mysterienspiel vom Leiden Israels ہے جو 1950 میں شائع ہوا۔ساکس کی شاعری میں غنائی عناصر بہت ہیں ۔ان کی ابتدائی کاوشوں میں خاص طور سے جرمن رومانوی اثرات نظر آتے ہیں۔انھوں نے برلن میں جو شاعری کی ہے وہ یہودیت سے زیادہ عیسائیت سے متاثر ہے۔ وہ روایتی نوعیت کی رومانوی تصویروں اور موضوعات کو پیش کرتی ہیں۔ ساکس کی شاعری عشقیہ ناکامی کا ماتم نہیں بلکہ یہودیوں کے ساتھ خدا کی ناانصافی اور تاریخ کا ماتم ہے۔

1923-2014

جنوبی افریقہ کی Nadine Gordimer کو 1991 میں نوبل انعام دیا گیا۔انھوں نے اپنی رزمیہ تحریروں کے ذریعہ نہ صرف ادب میں اپنی انفرادی شناخت قائم کی بلکہ عالم انسانیت کو بھی خاطر خواہ فائدہ پہنچایا ہے۔وہ جنوبی افریقہ کی ایک ماہیہ ناز ادیبہ ہونے کے ساتھ ایک سیاسی کارکن بھی تھیں۔ان کے ناول The Conservationist 1974 کو بوکر پرائز دیا گیا ۔ گورڈیمر کے ناول جنوبی افریقہ کی اخلاقی خرابیوں کا اظہار ہیں۔اس میں نسلی امتیازات کو خاص طور سے موضوع بنایا گیا ہے۔ یہاں تک کہ ان کے 'برگر کی بیٹی' جیسے ناول پر پابندی عائد کی گئی۔ان کا پہلا ناول The Lying days ہے جو 1953 میں منظر عام پر آیا تھا۔وہ نسل پرستی کے خلاف سر اٹھانے والی تحریکوں میں سرگرم رہتی تھیں۔ 1951 میں امریکا کی مشہور و معروف میگزین The New Yorker نے ان کی کہانی "A Watcher of the Dead" شائع کیا اور ایک طویل عرصے تک نشر واشاعت کا یہ سلسلہ جاری رہا۔اس طرح گورڈیمر عوامی سطح پر بھی مشہور و معروف ہو گئیں۔

1931-2019

ریاستہائے متحدہ امریکا کی Toni Morrison کو 1993 میں نوبل انعام دیا گیا۔ ماریسن نے ناول لکھنے کے ساتھ ادارت کی ذمہ داری بھی ادا کی۔ وہ Random House میں پہلی بلیک شعبہ فکشن کی مدیر تھیں۔ سیاہ ادب مرکز میں لانے کے تعلق سے ماریسن کا نام بہت اہم ہے۔ انھوں نے افریقی-امریکن شاعروں اور ناول نگاروں کی ایک جماعت تیار کی۔ ان کا پہلا ناول The Bluest Eye1970 میں شائع ہوا۔ ان کے تیسرے ناول Son of Solomon 1977 نے دنیا کی نگاہ اپنی جانب متوجہ کی۔ اس ناول پر انھیں National Book Critics Circle Award دیا گیا۔ پھر 1988 میں ان کے ناول Beloved 1987 کو PrizePulitzer سے نوازا گیا۔ ان کا ناول Sula1973 بھی نیشنل بک ایوارڈ کے لیے نامزد ہوا۔ ماریسن نے فکشن کے علاوہ تنقید نگاری کی طرف بھی توجہ دی۔ اس حوالے سے ان کی کتاب Playing in the Dark: Whiteness and the Literary Imagination 1992 بہت اہم ہے۔ اس کتاب میں گورے امریکی ادب میں افریقی وامریکی سیاہ فام ادیبوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔

1923-2012

پولینڈ کی Wislawa Szymborska کو 1996 میں نوبل انعام دیا گیا۔ وسلاواشمبورسکا پولینڈ کی ایک اہم شاعرہ، مضمون نگار اور ترجمہ نگار ہیں۔ ان نے فلسفیانہ موضوعات کو اپنی تحریروں میں جگہ دی ہے۔ ان کی بہت سی نظموں میں جنگ اور دہشت گردی ایک اہم موضوع ہے۔ ان کی طنزیہ شاعری انسانی حقیقت کو تاریخی اور حیاتیاتی سیاق میں پیش کرتی ہے۔ اسی سبب وہ بین الاقوامی سطح پر بہت مشہور ہوئیں۔ ان کی تخلیقات کا مختلف یوروپی زبانوں کے ساتھ عربی، ہبرو، جاپانی، فارسی اور چینی زبانوں میں ترجمہ کیا گیا۔ انھوں نے اپنی بہت کم نظمیں شائع کیں۔ جب ان سے اس بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے جواب دیا کہ میرے گھر میں کوڑے کا ڈبہ موجود ہے۔ شمبورسکا کی نظم Buffo کو 1985 میں Barbara Maria Nikiporczyk Zakrzewska- نے موسیقی کے لیے ترتیب دیا تھا۔ یہ ایک مشہور کمپوزر اور موسیقی کار تھے۔ ان کی نظم Love at First Sight فلم ٹرن لیفٹ، ٹرن رائٹ میں شامل کی گئی تھی۔

(b.1946)

آسٹریا کی Elfriede Jelinek کو 2004 میں نوبل انعام سے نوازا گیا۔ ادب میں ان کی حیثیت ایک ناول نگار اور ڈراما نگار کی ہے۔ ان کے ناولوں اور ڈراموں میں آوازوں کے نغمے ایک ندی کی طرح سیال نظر آتے ہیں۔ وہ بہت پر جوش لہجے میں معاشرے کی مکروہات کو پیش کرتی ہیں۔ تخلیقی سطح پر جیلنک آسٹریا کی ادبی روایتوں سے گہراانسلاک رکھتی ہیں۔ اگر چہ انھوں نے خود آسٹریائی نازی پر تنقید بھی کی ہے۔ ان کی تحریروں میں Ingeborg Bachmann, Marlen Haushofer, and Robert Musil. جیسے آسٹریائی مصنفیں کے گہرے اثرات ہیں۔ جرمن زبان وادب کے مشہور پروفیسر ایڈیٹر فریڈریک کا خیال ہے کہ جیلنک کی تحریروں میں جو سرمایہ دارانہ صارف معاشرہ ہے، وہ در اصل ماضی کی فسطائی حکومت کی بازگشت ہے۔ وہ اس سرمایہ دارانہ معاشرے کو مرداساس معاشرے کے طور پر بھی دیکھتی ہیں۔ جیلنک نے ریڈیائی ڈرامے، شاعری، تھیٹر ادب، مدلل مضامین، تالیف، ناول، ترجمے، اسکرین پلے، میوزیکل کمپوزیشن اور ویڈیو آرٹ وغیرہ میں غیر معمولی خدمات انجام دی ہیں۔ انھیں 1998 میں Georg Buchner انعام ملا۔ 2002 میں Mulheim Dramatist پرائز دیا گیا اور 2004 میں Franz Kafka انعام سے بھی نوازا گیا۔

1919-2013

برطانیہ کی Doris Lessing کو 2007 میں نوبل انعام دیا گیا۔ ڈورس لیسنگ کی پیدائش ایران میں ہوئی تھی، کچھ عرصہ افریقہ میں گزارا لیکن پھر 1949 میں مستقل برطانیہ میں سکونت اختیار کرلی۔ محض پندرہ سال کی عمر میں لیسنگ نے اپنی کہانیاں رسالوں کو فروخت کرنی شروع کیں۔ 'The Grass Is Singing' 1950 ان کا پہلا ناول ہے۔ ان کے جس ناول نے زمانے کی نگاہ متوجہ

کی وہ The Golden Notebook (1962) ہے۔ جب یہ شائع ہوا تو آزادیِ نسواں کے ہم نواؤں نے اسے شرف قبولیت سے نوازا لیکن ڈورس نے اس تحریک کے تئیں کبھی جوش وجذبے کا اظہار نہیں کیا۔ Children of Violence (1952–1969) اور Canopus in Argos: Archives(1979–1983) وغیرہ ان کے اہم ناول ہیں۔سویڈش اکیڈمی نے کہا کہ وہ ایک ایسی تجربہ کار رزمیہ نگار خاتون ہیں جن کی شخصی تعمیر غیر معمولی بصیرت ،تشکیک اور داخلی لہر سے ہوئی ہے۔ انھوں نے ایک منتشر تہذیب کو تحقیق کا موضوع بنایا ہے۔جس وقت لیسنگ کا انتقال ہوا،ان کے تقریباً 50 ناول شائع ہو چکے تھے۔

(b.1953)

جرمنی اور رومانیہ کی Herta Muller کو 2009 میں نوبل انعام دیا گیا۔ادب میں ان کی حیثیت ایک ناول نگار، شاعرہ اور مضمون نویس کی ہے۔ ہرٹا مولر کی پیدائش رومانیہ میں ہوئی لیکن پھر وہ 1987 میں جرمنی منتقل ہو گئیں۔رومانیہ کے تاناشاہ Nicolae Ceauescu کے زمانے کی مشکل صورت حال پر انھوں نے کھل کر لکھا اور جرمن اقلیت کے حوالے سے بہت کام کیے۔اسی سبب ایک بے باک مصنفہ کے طور پر ان کی شناخت قائم ہوئی ہے۔ان کا ناول The Hunger Angel رومانیہ میں مقیم جرمن اقلیتوں کی جلاوطنی کے اس دور کی تصویر کشی کرتا ہے جب سویت یونین رومانیہ پہ قابض ہو گیا تھا اور جرمن مزدوروں کو سویت یونین کی طرف جلاوطن کیا جارہا تھا۔مولر نے اپنی زندگی میں بیس سے زائد ایوارڈ حاصل کیے۔مولر کی پہلی کتاب Nadirs تھی جو 1982 میں جرمن زبان میں شائع ہوئی تھی۔ان کی اس کتاب کو یونین آف کمیونسٹ کی مرکزی کمیٹی سے انعام ملا۔سویڈش کمیٹی نے یہ کہا کہ مولر کی شاعری میں ارتکاز اور نثر میں بے تکلفی ہے۔سویڈیش اکیڈمی نے مولر کے طرز کا موازنہ کافکا سے کیا ہے۔اکیڈمی نے اس بات کا بھی اعتراف کیا کہ مولر نے اقلیتی ہونے کے باوجود کمیونزم کے غیر انسانی رویے کو نظر انداز نہیں کیا اور بہت بیباکی کے ساتھ اس رویے کی تنقید کی۔

کینیڈا کی Alice Munro کو 2013 میں نوبل انعام دیا گیا۔ ان کی حیثیت مختصر افسانہ نگار کی تھی۔ان کے افسانوں میں علاقائی ثقافت ، کردار اور موضوعات کو جگہ دی گئی ہے۔ان کی کہانیاں سادگی کے ساتھ

(1931-2024)

مشکل نثری انداز اور انسانی زندگی کے پیچیدہ مسائل کا اظہار ہیں۔انھیں 2009 میں انٹرنیشنل بوکر پرائز دیا گیا۔انھیں تین بار Canada's Governor General's Award for Fiction دیا گیا۔پہلی بار انھیں یہ ایوارڈ Dance of the Happy Shades (1968) کے لیے دیا گیا۔ان کے اس افسانوی مجموعے کی سب سے زیادہ پذیرائی ہوئی۔انھیں دوسری بار Who Do You Think You Are? کے لیے Canada's Governor Award ملا۔یہ دونوں ان کے افسانوی مجموعے تھے جن کی کہانیوں کے مابین موضوعاتی ربط ہے ۔ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ 1980 میں بوکر پرائز فار فکشن کے لیے نامزد ہوا اور اسی کے بین الاقوامی نام The Beggar Maid پر انھیں نوبل انعام بھی ملا۔ان کے افسانوی مجموعوں کو تیرہ زبانوں میں منتقل کیا گیا۔انھوں نے 2013 کے قریب لکھنا بند کر دیا تھا اور 2024 میں ان کا انتقال ہوا۔

(b. 1948)

بیلاروس کی Svetlana Alexievich کو 2015 میں نوبل انعام دیا گیا۔ وہ تفتیشی صحافی کے ساتھ ساتھ زبانی مؤرخ اور مضمون نگار تھیں اور روسی زبان میں لکھتی تھیں۔وہ بیلاروس کی پہلی خاتون تھیں جن کو کثیر الاصواتی تحریروں کے لیے نوبل انعام دیا گیا۔الیکسیاوچ کی کتابیں سویت اور سویت کے بعد کے افراد کی جذباتی تاریخ ہیں۔اس تاریخ کو انھوں نے انٹرویو کے کولیجز کے ذریعہ بڑے احتیاط سے تیار کیا ہے۔روسی مصنف اور ناقد DmitryBykov کے مطابق الیکسیاوچ کی تصنیفات بیلاروسی مصنف Ales Adamovich کے خیالات سے مستفیض ہیں۔ الیکسیاوچ نے یہ محسوس کیا تھا کہ موجودہ عہد کے مسائل کا اظہار افسانوں میں نہیں ہوسکتا بلکہ اس کے لیے گواہوں کی شہادتوں کو محفوظ کرنا ہوگا۔ انھوں نے خود بھی اعتراف کیا ہے کہ میرے خیالات بیلاروسی مصنف Vasil Bykau اور Ales Adamovich سے مستفیض ہیں۔وہ Varlam Shalamov کو سب سے بہترین مصنف خیال کرتی ہیں۔

پولینڈ کی Olga Tokarczuk کو 2018 میں نوبل انعام

b. 1962

دیا گیا۔ پولینڈ میں ان کی تنقید کو اعتبار کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ سویڈش کمیٹی نے یہ کہا کہ ان کے ناول فلائٹ میں تخیلاتی بیانیہ ایک عظیم انسانی جذبے کے طور پر نظر آیا ہے۔ انھوں نے سرحد کے عبوری عمل کو زندگی کا ایک اہم حصہ خیال کیا ہے۔ انھیں 2018 میں فلائٹ کے لیے بوکر پرائز بھی دیا گیا۔ The Book of Jacob اور Flight کے لیے انھیں پولینڈ کا سب سے اعلی ادبی انعام the Nike Awards, دیا گیا۔ The Book of Jacob ان کا سب سے شاہکار ناول ہے۔ ان کا افسانوی لہجہ ان کی شناخت ہے۔ ان کی پہلا نظموں کا مجموعہ Cities in Mirrors کے عنوان سے 1989 میں شائع ہوا تھا۔ ان کا پہلا ناول The Journey of the Book-People ہے جو 1993 میں آیا۔ اس ناول میں دو محبت کرنے والوں کی داستان ایک تمثیل میں پیش کی گئی ہے۔ یہ ناول زندگی کی معنویت کا استعارہ ہے۔ اس ناول کو پولینڈ کے ناقدین نے بہت احترام کی نگاہ سے دیکھا اور انھیں اس پر Polish Publisher's Prize دیا گیا۔ ان کے ناول 2010 Primeval and Other Times میں خیالی، اسطوری اور افسانوی دنیا آباد ہے۔ ناول میں تاریخ ایک جوابی خواب ہے جو مخلوقات کے عجائب اور جادو سے بھری ہوئی ہے۔ اسی ناول نے بین الاقوامی سطح پر مصنف کی شناخت قائم کی۔

1943-2023

ریاستہائے متحدہ امریکہ کی Louise Gluck کو 2020 میں نوبل انعام ملا۔ وہ ایک امریکی شاعرہ اور مضمون نگار تھیں۔ ان کے متعلق سویڈیش کمیٹی نے یہ کہا کہ ان کی آواز فرد کو ذات کے نہاں خانوں سے نکال کر آفاق تک لے جاتی ہے۔ انھیں 2003 سے 2004 تک کے عرصے میں Pulitzer Prize, National Humanities Medal, National Book Award, National Book Critics Circle Award, اور Bollingen Prize. دیے گئے۔ لوئیس گلگ کی شناخت ایک ایسی شاعرہ کے طور پر قائم ہوئی ہے جس نے اپنی زندگی کی کہانی نظم کی ہے۔ ان

”وہ فرانسیسی مصنفہ ہیں اور انھوں نے اپنی تحریروں کو آپ بیتی کی شکل میں پیش کیاھے۔ان کی تحریروں میں یادداشت کابھت اہم رول ھے ۔ انھوں نے اپنی تحریروں کوافسانوی یاغیر افسانوی کھے جانے کی مخالفت کی ۔ایر ناکس نے ایک انٹرویومیں یہ کھا کہ بھت زیادہ لکھنے سے بھتریہ ھے کہ ایمانداری کے ساتھ کم لکھاجائے ۔ ان کایہ خیال محض ایک بات نھیں بلکہ ان کی پوری زندگی کا ماحاصل ھے۔انھوں نے اپنی ادبی زندگی کاآغاز 1974سے خود سوانحی ناولClean outسے کیا۔“

کی شاعری جذبات کی شدت، ذاتی تجربات اور نئی شاعری کا اظہار ہے۔ انھوں نے بیشتر موقعوں پر مظاہر فطرت کی تصویر کشی کی ہے۔ موضوعاتی سطح پر ان کی نظموں میں غم واندوہ اور زندگی کی ادھوری خواہشوں کا اظہار کیا گیا ہے۔ اس سبب ان کی شاعری اداسی اور تنہائی کا استعارہ بن گئی۔ محققین نے کہا ہے کہ ان کی آپ بیتی اور کلاسیکی تصور وخیال میں گہرا انسلاک ہے۔ ان کی شاعری مختلف رسائل میں شائع ہوئی ہے۔

b. 1940

فرانس کی Annie Ernaux کو 2022 میں نوبل انعام دیا گیا۔ وہ فرانسیسی مصنفہ ہیں اور انھوں نے اپنی تحریروں کو آپ بیتی کی شکل میں پیش کیا ہے۔ ان کی تحریروں میں یادداشت کا بہت اہم رول ہے۔ انھوں نے اپنی تحریروں کو افسانوی یا غیر افسانوی کہے جانے کی مخالفت کی۔ ایرناکس نے ایک انٹرویو میں یہ کہا کہ بہت زیادہ لکھنے سے بہتر یہ ہے کہ ایمانداری کے ساتھ کم لکھا جائے۔ ان کا یہ خیال محض ایک بات نہیں بلکہ ان کی پوری زندگی کا ماحاصل ہے۔ انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز 1974 سے خود سوانحی ناول Clean out سے کیا۔ انھیں ایک دوسرے خودسوانحی ناول A Man's Place پر Renaudot Prize انعام دیا گیا۔ ان کا یہ ناول ان کے والد کے

ساتھ خراب تعلقات کا اظہار ہے۔ان کے والد ایک کیفے چلاتے تھے اور بہت سخت مزاج انسان تھے۔ ان کے مزاج کی سختی کا اپنی ایرناکس نے گہرا اثر قبول کیا ہے۔ جب ان کی عمر بارہ سال کی تھی تو ان کے والد نے ان کی والدہ کو مارنے کی کوشش کی ۔ ایرناکس نے اس بات کا ذکر 'شرم' میں کیا ہے۔ ایرناکس اپنی زندگی میں بہت جلد خود سوانح نگاری کی طرف متوجہ ہوگئیں اور انھوں نے تاریخی اور انفرادی تجربوں کے اظہار کے لیے خود نوشت سوانح نگاری کو وسیلہ بنایا۔اس سیاق میں انھوں نے اپنے والدین ،سماجی ارتقا،کمسنی کے واقعات ،اپنی شادی ،ایک مشرقی یوروپی آدمی سے اپنے معاشقے،اسقاط حمل،اپنی والدہ کی موت وغیرہ کی داستان رقم کی ہے۔The Year 2008 ناقدین ادب کی نگاہ میں ایرناکس کا سب سے بڑا شاہکار ہے۔ اس میں ایرناکس نے خود کو پہلی بار تیسرے شخص کے طور پر پیش کیا اور دوسری جنگ عظیم کے فوراً بعد کے فرانسیسی معاشرے پر ایک گہری نگاہ ڈالی ہے۔مختلف انعامات کے علاوہ 2019 میں انھیں انٹرنیشنل بوکر پرائز کے لیے بھی نامزد کیا گیا۔

(b. 1970)

جنوبی کوریا کی Han Kang کو 2024 میں نوبل انعام دیا گیا ہے۔انھوں نے 1993 سے لکھنا شروع کیا تھا۔انھیں اپنے ادبی سفر کے دوران شاید یہ خیال نہیں آیا ہوگا کہ تین دہائیوں بعد ہی انھیں نوبل انعام مل جائے گا۔ان کے ناول ویجی ٹیرین The Vegetarian کا کورین زبان سے انگریزی زبان میں Deborah Smith نے ترجمہ کیا ہے۔اسمتھ محض 28 سال کے برطانوی ریسرچ اسکالر ہیں۔انھوں نے چھ سال قبل ہی کورین زبان سیکھنی شروع کی تھی۔ہان کانگ نے اسمتھ کے اس ترجمے کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا تھا۔اسمتھ کے اس انگریزی ترجمے کو دیکھ کر اسما حسین نے شاکاہاری کے نام سے، ابن آس محمد نے سبزی خور اور عامر حسین نے دی ویجی ٹیرین کے نام سے ترجمہ کیا ہے۔ویجی ٹیرین کو پوری دنیا کے ناقدین نے ایک خیال کی کہانی کہا ہے۔ویجی ٹیرین کوریا کے ایک نئے معاشرے کی کہانی ہے۔ناول میں بہت سارے کردار آئے ہیں لیکن اس کا اصل کردار ایک عورت ہے جو آئندہ زندگی ایک ویجی ٹیرین کے طور پر گزارنا چاہتی ہے۔کوریا کی تہذیبی زندگی کے تناظر میں ایک عورت کا ویجی ٹرین بن کر زندگی گزارنا بہت اہم اور بامعنی ہے۔اسمتھ کا انگریزی ترجمہ 2015 میں برطانیہ سے اور 2016 میں امریکہ سے شائع ہوا۔ان اشاعتوں کے ساتھ ہی بین الاقوامی سطح پر ناول کو بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی ۔ ویجی ٹیرین کو 2016 میں Man Booker International Prize سے نوازا گیا۔نوبل انعام ملنے کے بعد ہان کانگ کے اس ناول کو کوریا کے ترجمہ شدہ ناولوں میں سب سے اہم خیال کیا گیا ہے۔اس سے قبل 2012 میں Kyung-Sook Shin کے Please Look After Mom کو ادب کا سب سے وقیع کام خیال کیا گیا تھا۔

□□□

Dr. Syed Md. Saquib Faridi
H-74, 4th Floor, Muradi Road
Batla House
Near Shahab Masjid
Mob.: 9911234158
saquibfaridi@gmail.com

مباحثہ

خواتین کے کن موضوعات اور مسائل پر توجہ دینے کی ضرورت ہے

حمیرہ سعید

صغرا ہمایوں مرزا کی ادبی وسماجی خدمات

"صغرا ہمایوں مرزا ایک اچھی ناول نگار، ادیبہ اور شاعرہ ہیں۔ اُنھوں نے الگ الگ اصناف میں طبع آزمائی کی، شاعری کی، موسیقی پر کتابیں لکھیں، ناول لکھے اور سفرنامے بھی لکھے۔ گلشن ترنم، نصیحت کے موتی، بی بی طورٰی کا خواب، زھرہ، مشیر نسواں، موھنی اور سرگزشت ھاجرہ جیسی کتابیں لکھیں۔ اس کے علاوہ سفر نامہ عراق، سفرنامہ پونا اور والیٹر، سفر نامہ یورپ، سفر نامہ بہار وبنگال، سیاحت جنوبی ہند اور رہبر کشمیر جیسے سفرنامے بھی لکھے۔"

صغرا ہمایوں مرزا کا شماراردو کی اولین خاتون ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔صغرا ہمایوں مرزا نے 1884 میں جب صفدر علی مرزا کے گھر جنم لیا تو اس وقت حیدر آباد کی نسوانی دنیا بالکل الگ تھی۔عورتیں گھروں کی چار دیواری میں قید تھیں۔ تہذیب وتمدن کے اقدار کچھ اور تھے۔ پردے کا رواج عام تھا۔لڑکیوں کی تعلیم وتربیت کے لیے مدرسوں کا انتظام نہیں تھا۔شرفا اپنی لڑکیوں کو مدرسوں میں بھجوانے کے عادی نہیں تھے۔ایسے ماحول میں صغرا بیگم کی تعلیم وتربیت گھر پر ہی ہونے لگی۔علم وادب کے حصول اور شوق نے ان کی مختلف معلومات میں اضافہ کیا۔اُنھوں نے دیکھا کہ عورتیں مختلف مسائل میں گھری ہوئی ہیں۔تعلیم سے محرومی، پردہ کی پابندی اور ان کی دیگر مجبوریوں کا احساس کر کے صغرا ہمایوں مرزا نے عورتوں کے مسائل یکسوئی اور ان کی بیداری وترقی کا بیڑہ اٹھایا۔قدامت پسند ماحول اور غیر مساویانہ رویوں کے خلاف اُنھوں نے خاموشی سے ہتھیار نہیں ڈالے بلکہ عورتوں کی اصلاح، ترقی وآزادی کے لیے باقاعدہ کام کرنے لگیں۔

صغرا ہمایوں مرزا ایک حساس، دردمند سماجی کارکن اور صنف نسواں کی محسن تھیں۔اُنھوں نے مختلف انجمنوں سے جڑ کر خواتین کے رسائل کی ادارت کر کے، مدرسہ قائم کر کے عورتوں کی زندگی بدلنی چاہی۔ پرانی روایتوں اور رواجوں کے خلاف آواز اٹھائی۔ان سماجی وفلاحی کاموں کے علاوہ صغرا ہمایوں مرزا نے اُردو ادب میں بھی گراں قدر اضافہ کیا۔اُردو کے ابتدائی لکھنے والوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔اُنھوں نے نہ صرف اپنے عمل سے بلکہ قلم سے بھی خواتین کی آزادی تعلیم وتربیت کے لئے کام کیا۔بقول

طیبہ خسرو :

''صغرا بیگم کی اولوالعزمی اور عورتوں کے مسائل سے گہری دلچسپی اور لگاؤ نے لاکھوں پروہ نشین خواتین کے اندھیرے راستے میں اُجالے پیدا کردیے۔ان میں عام بیداری پیدا کر دی کے وہ خود اپنی منزل پہچان سکیں'' 1

صغرا ہمایوں مرزا ایک اچھی ناول نگار، ادیبہ اور شاعرہ ہیں۔ اُنھوں نے الگ الگ اصناف میں طبع آزمائی کی، شاعری کی، موسیقی پر کتابیں لکھیں، ناول لکھے اور سفرنامے بھی لکھے۔ گلشن ترنم، نصیحت کے موتی، بی بی طوریٰ کا خواب، زہرہ، مشیرنسواں، موہنی اور سرگزشت ہاجرہ جیسی کتابیں لکھیں۔اس کے علاوہ سفرنامہ عراق، سفرنامہ پونا اور والیٹر، سفر نامہ یورپ، سفر نامہ بہار و بنگال، سیاحت جنوبی ہند اور رہبر کشمیر جیسے سفرنامے بھی لکھے۔

''سرگزشت ہاجرہ'' اور ''موہنی'' ان کے ناول ہیں۔ان کے ناول ''موہنی'' میں مافوق الفطری عناصر ملتے ہیں۔ اس میں داستانوی رنگ نمایاں ہے۔اس کے علاوہ اس میں ایران کی تہذیب وتمدن کی تفصیلی مرقع کشی کی گئی ہے۔جبکہ عورتوں کے مسائل پر لکھا گیا نسائی حسّیت کے موضوع پر ان کا ناول ''سرگزشت ہاجرہ'' اہم ہے۔ لہٰذا اسی ناول پر تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا اور ان کی نسائی حسیت کو جاننے کی کوشش کی گئی ہے۔

''سرگزشتِ ہاجرہ'' صغرا ہمایوں مرزا کا ایک اہم اور اصلاحی ناول ہے۔صغرا ہمایوں نے اس وقت لکھنا شروع کیا جب خواتین ادبی دنیا میں قدم رکھ رہی تھیں۔ تعلیمی بیداری کے تحت لوگوں میں شعور بیدار ہو رہا تھا۔ روایتی زندگی سے قطع تعلق کر کے لوگ عملی طور پر حقائق کو پرکھ رہے تھے۔ لیکن ہندوستانی معاشرہ میں ایسا کرنے والوں کی تعداد نہ کے برابر تھی اور خاص کر خواتین کی کیونکہ ہندوستانی مرد اساس معاشرہ میں خواتین کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ صغرا ہمایوں مرزا نے جب قلم اُٹھایا تو خواتین کی زندگی کو ہی موضوع بنایا۔

''سرگزشت ہاجرہ'' بھی خواتین کے لیے لکھا گیا اصلاحی ناول ہے۔جس میں صغرا ہمایوں مرزا نے خواتین کی تربیت، ازدواجی زندگی کی کامیابی کے اُصولوں کو پیش کیا ہے۔اس ناول میں دراصل ہاجرہ سارا اور مسزعون کو اپنی آپ بیتی سناتی ہے پھر مسزعون، سارا اور استانی بھی اپنے اپنے تجربات بیان کرتی ہیں۔دوران گفتگو یہ لوگ عورتوں کے مسائل اور حالات پر بھی اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔

صغرا ہمایوں مرزا نے یہ ناول خواتین کو سمجھانے کے انداز میں لکھا ہے۔لیکن شاید نادانستہ طور پر اس وقت سماج میں عورت کی حالت دیکھ کر آنے والے فکر انگیز خیالات بھی پیش کر دیے ہیں۔ جب ہاجرہ کہتی ہے کہ نکاح کے وقت وہ اپنے شوہر سے بالکل انجان تھی لیکن ماں باپ کے بھروسہ پر نکاح کر لیا تو اسے احساس ہوتا ہے کہ اس وقت بھی لڑکی اپنے اوپر ہونے والی زبردستی اور حاکمیت کا دکھ محسوس کرتی تھی۔ہاجرہ کہتی ہیں۔

چاہے لڑکا زنگی حبشی ہو یا خوبصورت جوان ہو یا اسی برس کا بوڑھا عالم ہو یا جاہل ہر حال میں ہاں کہنا ہی شریف لڑکیوں کا کام ہے۔میرے والدین روشن خیال تعلیم یافتہ تھے۔مگر اُنھوں نے بھی شادی سے قبل مجھ سے نہ پوچھا کہ تم کو یہ انتخاب پسند ہے یا نہیں۔ 2

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت بھی لڑکی اپنے ساتھ کی گئی ناانصافی کا احساس رکھتی تھی لیکن روایتی بندھنوں میں اس قدر جکڑی ہوئی تھی کہ اس کا انکار تک نہیں کر سکتی ہے لیکن اس نے روایت کو بدلنے کی بات ضرور کی ہے۔ناول میں سارا کہتی ہے۔

''واقعی ہند میں یہ بہت بڑا ظلم ہو رہا ہے۔اس کے دفیعہ کی تدابیر صاحب ہم لوگوں کو کرنا چاہیے......اب تو یہ رواج ہے کہ لڑکی اپنی نسبت کی خبر تک نہیں سن سکتی، جہاں نسبت کا ذکر نکلا لڑکی وہاں سے اُٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہے، میرے خیال میں یہ جھوٹی شرم ہے اور والدین کا ظلم ہے۔ 3

صغرا ہمایوں مرزا کا مقصد خواتین کو کامیاب زندگی کے گر بتانا تھا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ ان پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالنا نہیں بھولتیں جو عورت پر کئے گئے مظالم سے متعلق ہے۔وہ بھی چونکہ عورت ہے اس لیے چاہتی ہیں کہ عورت پر زور زبردستی نہ کی جائے بلکہ اسے بھی اپنی مرضی سے جینے کا حق دیا جائے۔وہ مرد حضرات کے عورتوں سے ناروا رکھنے والے سلوک پر اپنے کردار ہاجرہ کی زبانی یہ بتاتی ہیں۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مرد ہم کو حقیر جانتے ہیں حالانکہ ہمارے سبب سے ان کی عزت ہے، ہمارے سبب سے ان کی آبرو ہے، ہمارے سبب سے ان کا وجود ہے ہے'' 4

آگے صغرا عورت کی وجہ سے مرد کی اہمیت کے بارے میں کہتی ہیں کہ:

''بے باپ کا بچہ پیدا ہوا ہے لیکن بے ماں کا بچہ آج تک پیدا نہیں ہوا''۔ 5

صغرا سمجھتی ہے کہ مرد کی آبرو، دولت، خاندان اور بچہ سب عورت ہی کے نام سے ہے۔اس لیے عورت رتبہ میں مرد سے برتر ہوسکتی ہے لیکن

''ہم کو یہ کوشش کرنی چاہیے۔ والدین اپنی لڑکی ہرگز ایسے شخص کو نہ دیں جس کے پاس پہلی بی بی موجود ہو۔ خواہ اس کو اولاد ہو یا نہ ہو۔ اگر بی بی مرچکی ہو تو لڑکی دی جائے لیکن ایک بی بی کے ہوتے دوسرا عقد نہ کرنا چاہیے، دوسرے یہ کہ عقد ثانی کرنے کا رواج ڈالا جائے بیوہ عورتوں کو ترغیب دی جائے جو عورت جوان بیوہ ہو اس کو عقد ثانی کرنا واجب کر دیا جائے۔'' 6

''صغرا ہمایوں مرزا عورتوں کی سماجی حیثیت سے واقف تھیں اسی لیے وہ چاہتی تھیں کہ جھوٹے سماجی بندھنوں سے عورت کو آزاد کیا جائے۔ اسی لیے اُنھوں نے اپنے کردار ہاجرہ کے ذریعہ ان مسائل سے باہر آنے کا حل بتایا ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ سماج میں بیوہ کو ہر خوشی سے محروم کر کے غلط کیا جا رہا ہے اور اگر کوئی عورت ایسا کرنا بھی چاہے تو والدین اور رسم و رواج اسے ایسا نہیں کرنے دیتے اس لیے ہاجرہ کہتی ہے۔''

صغرا ہمایوں مرزا عورتوں کی سماجی حیثیت سے واقف تھیں اسی لیے وہ چاہتی تھیں کہ جھوٹے سماجی بندھنوں سے عورت کو آزاد کیا جائے۔ اسی لیے اُنھوں نے اپنے کردار ہاجرہ کے ذریعہ ان مسائل سے باہر آنے کا حل بتایا ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ سماج میں بیوہ کو ہر خوشی سے محروم کر کے غلط کیا جا رہا ہے اور اگر کوئی عورت ایسا کرنا بھی چاہے تو والدین اور رسم و رواج اسے ایسا نہیں کرنے دیتے اس لیے ہاجرہ کہتی ہے۔

''بیوہ عورتیں عقد ثانی کرنا چاہتی ہیں ان کے والدین سر راہ ہوتے ہیں اور رواج مانع ہے۔ اس لیے اگر کوشش کی جائے تو اکثر بیوہ عورتیں عقد ثانی کر لیں گی۔''

ہاجرہ اپنی اچھی تربیت کی وجہ سے اپنی ازدواجی زندگی کو کامیاب بنا لیتی ہے لیکن اس کا اصل مقصد عورت کی حالت میں سدھار لانا ہے۔ وہ اپنے ساتھیوں کو مخاطب کر کے کہتی ہے :

''مجھے تین کاموں کی بڑی فکر ہے، خدا نے چاہا تو کر کے چھوڑوں گی۔ ایک زنانہ تربیت گاہ میں قائم کروں...... دوسرے اس کی کوشش کی جائے کہ کمسن بیوہ عورتوں کا عقد ثانی کیا جائے۔ ان کو ترغیب دی جائے۔ تیسرے ایسے شخص کو والدین لڑکی نہ دیں جس کی پہلی بیوی زندہ ہو۔ اس کے لیے بڑی کوشش کرنی ہوگی۔

غرض صغرا نے ہاجرہ کے روپ میں اس عورت کو پیش کیا جو اخلاقی طور پر بلند ہے اپنے عقل وفہم سے زندگی کو کامیاب بناتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ خواتین کی حالت میں سدھار لانا چاہتی ہے۔ صغرا نے ہاجرہ کے تینوں کاموں کے ذریعہ دراصل سماج کے تین اہم مسئلوں کی طرف توجہ مبذول کروائی ہے۔ صفرا ہمایوں مرزا کی یہ سوچ یہ خیالات دراصل ان کی نسائی حسیت کا پتہ دیتے ہیں حالانکہ ناول میں زیادہ تر اخلاقی پہلوؤں پر ہی زور دیا گیا اور عورت کو نامناسب حالات میں بھی سوجھ بوجھ سے کام لے کر زندگی گزارنے کی تلقین کی گئی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ نکاح کے لیے لڑکی کی مرضی اور بیواؤں کی دوسری شادی جیسے موضوعات پر قلم اُٹھا کر صغرا نے اپنے تئیں اس کا حل بھی پیش کیا ہے۔

حوالے:

1 صغرا بیگم اور نسوانی دنیا۔ طیبہ خسرو۔ یاد صغرا ہمایوں مرزا۔ اکتوبر 1976۔ ص 23۔ مرتب مرزا سرفراز علی

2 (سرگزشت ہاجرہ۔ از صغرا ہمایوں مرزا۔ ص13)

3 (سرگزشت ہاجرہ۔ از صغرا ہمایوں مرزا۔ ص13۔14)

4 (سرگزشت ہاجرہ۔ از صغرا ہمایوں مرزا۔ ص20)

5 (ایضاً)

6 (سرگزشت ہاجرہ از صغرا ہمایوں مرزا ص47)

7 (سرگزشت ہاجرہ از صغرا ہمایوں مرزا ص57)

8 سرگزشت ہاجرہ۔ از صغرا ہمایوں مرزا۔ ص 91

Dr. Humera Sayeed

Associate Prof.

H.No 8-1-346/2/B

Flat No 402

Irfan Avenue,Sabza colony

Toli chowki, Hyderabad -500008 (T.S)

Cell 9346377993

شاعرات کے منتخب اشعار

بلقیس جمال

آ سکوتِ شام میں پھر نالہ پیہم کریں
آ لب خاموش کو ہم واقفِ ماتم کریں

کھینچ لیں سینہ سے پھر پوشیدہ نوکیں
تیر کی زخمہائے چاک دل شرمندہ ماتم کریں

جہاں بانو بیگم

سونے والے چونک غفلت سے سحر ہونے کو ہے
پھر ہم آغوش تجلی برگ و بر ہونے کو ہے

قافلے کو کوچ پھر اے بے خبر ہونے کو ہے
تو پڑا سوتا ہے کیوں کیا دربدر ہونے کو ہے

صفیہ شمیم ملیح آبادی

جان سی پڑ گئی ہے صحرا میں
چاندنی بہہ رہی ہے دریا میں

چیتھڑوں سے جسم لاغر ہے ڈھکا
کائنات دل میں ہے محشر بپا

عارفہ بیگم انجم

نہ دیکھو ہٹا لو نظران کے رخ سے
حیادار آنکھیں جھکی جارہی ہیں

یہ پرکیف منظر ہے کیا روح پرور نگاہیں
نگاہوں کو شرمارہی ہیں

کنیز فاطمہ حیا

آؤ دیکھو کہ سراپا غم پنہاں ہوں میں
شمع کی طرح سے اک شعلہ سوزاں ہوں میں

دل شکستہ ہوں ستم کش ہوں پریشاں ہوں
میں درد شاہد ہے کہ منت کش درماں ہوں میں

ظریفہ

بہتر تو یہی تھا کہ مجھے پیار نہ کرتے
کرتے بھی تو رسوا سر بازار نہ کرتے

میں آپ دکھاتی تمہیں سو رنگ کے جلوے
تم حسرت دیدار کا اظہار نہ کرتے

عزیز جہاں ادا

تارہ سمجھ کے اک اک ذرہ کو چومتی ہوں
کچھ پا کے کھو دیا ہے اب اس کو ڈھونڈتی ہوں

تکتی ہوں میں فلک کو حیران ہو رہی ہوں
ارمان آرزو کی لاشوں پہ رو رہی ہوں

انوار فاطمہ شمیم

شاید اب عشق ہو گیا کامل
غم میں لذت سی پا رہی ہوں میں

دیکھئے کس ستم کا ہو آغاز
پھر انہیں یاد آ رہی ہوں میں

راکیش کمار

لل دید کی شاعری اور فلسفۂ حیات

جس طرح اردو ادب میں ولی دکنی کا نام اور وطن ایک عرصے تک موضوع بحث بنا رہا کہ اہل گجرات انھیں گجرات کا باشندہ ثابت کرتے تھے اور اہل دکن انھیں ولی اورنگ آبادی۔ ٹھیک یہی معاملہ وادی کشمیر کی ایک عظیم شاعرہ کے ساتھ بھی رہا ہے۔ ان کے نام، تاریخ پیدائش اور مقام پیدائش میں مختلف محققین کی مختلف آرا موجود ہیں۔ للیشوری، جنھیں عام طور پر لل دید، لالا، یوگیشوری یا لالا عارفہ کے نام سے جانا جاتا ہے، چودھویں صدی عیسوی میں کشمیر کی مشہور صوفی شاعرہ تھیں۔ ان پر لکھی گئی اکثر و بیشتر کتب میں ان کی پیدائش 1320 کے قریب پانپور کے ایک گاؤں پاندریٹھن میں اور وفات 1392 میں کشمیر ہی میں ہوئی تھی۔ جب کہ ڈاکٹر این صدف نے اپنی کتاب ”Kashmir: A Cultural and Literary History“ میں اور اے۔ بی پنڈت نے اپنی کتاب ”Lal Ded: The Mystic Poetess of Kashmir“ میں ان کا مقام پیدائش ”لل پورہ“ لکھا ہے۔ ان کا اصل نام للیشوری تھا، لیکن پیار سے انھیں لل دید (لالہ) کہا جاتا تھا۔ ان کی ابتدائی زندگی کے بارے میں زیادہ معلومات دستیاب نہیں ہیں لیکن یہ کہا جاتا ہے کہ وہ ایک مہذب خاندان میں پیدا ہوئیں اور ان کی شادی کم عمری میں ہی کر دی گئی۔ ان کی شادی ایک سخت گیر اور غیر ہمدرد شخص سے ہوئی تھی، جس کے چلتے انھیں اپنی شادی شدہ زندگی میں محبت کی دیوی میرا کی طرح بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک دشمن ساس اور مشکوک شوہر نے انھیں سماجی بندشیں توڑنے پر مجبور کیا اور وہ روحانی جستجو کے راستے پر چل پڑیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس راستے پر ان کے گرو سدھا مول نے ان کی رہنمائی کی جو ایک کشمیری شیو عالم تھے۔ جیسا کہ اکثر بڑی شخصیات کے متعلق یہ مسئلہ رہا ہے کہ ان کی پیدائش، مقام پیدائش اور اصل نام کے متعلق اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ ٹھیک یہی معاملہ لل دید کے ساتھ بھی رہا ہے۔ ان کے نام، پیدائش اور مقام پیدائش کے بارے میں اکثر و بیشتر ایک جیسی روایات ہی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ مگر لکھنے والوں نے محض الفاظ کے تبدیلی کے ساتھ دوسروں سے مختلف نظر آنے کے لیے اس میں اختلاف کی صورت پیدا کر دی۔ ان کے نام کے ساتھ ان کے مذہب کے متعلق بھی مختلف لوگوں کے مختلف بیانات ہیں۔ ان کی زندگی اور کام کا مطالعہ مختلف پس منظر سے تعلق رکھنے والے مسلم اور غیر مسلم مصنفین نے کیا ہے۔ اس لیے ان میں اختلاف رائے کا پایا جانا فطری ہے۔ یہی وہ اسباب ہیں کہ جس کی وجہ سے ایک ایسی شخصیت جس پر اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے، پھر بھی مزید لکھنے کا امکان باقی رہتا ہے۔ اکثر لکھنے والوں کی تعداد ایسی ہے جنھوں نے خود ہی یہ فیصلہ کر دیا کہ وہ اس مذہب کی پیروکار ہیں۔ اس سلسلے میں کئی کتابوں کو بطور حوالہ پیش کیا جا سکتا ہے کہ جن میں مختلف مذاہب کے ماننے والوں نے انھیں اپنے مذہب کا پیروکار بتایا ہے۔ لیکن میں یہاں رضا عارف کی ایک کتاب کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ جنھوں نے اپنی انگریزی کتاب ”لل دید“ کے صفحہ نمبر 3 میں خود لل دید کی ایک بات کو بطور حوالہ پیش کیا ہے:

"I was born in srinagar,i worship no idol, nor do i worshid inmosque. my name is lalleshwari."[1]

اس قول سے لل دید کے نظریہ مذہب کے متعلق لکھنے والوں کے لیے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ ان کا نظریہ زندگی دوسروں سے مختلف تھا۔ ان کا کام اور فلسفہ مذہب کی حیثیت سے باہر تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی کے مقاصد پر عمیق غور و فکر کرنے کے بعد اپنے لیے ایک نئی راہ کا انتخاب کیا ہے۔ اسی سبب سے انھیں ایک صوفی، شاعرہ اور عارفہ کہا جاتا ہے۔ اُن کی شاعری میں خدا، محبت، انسانیت، اور فطرتی حقائق کی بہت خوبصورت عکاسی ہے۔ ان کی شاعری کا اثر نہ صرف کشمیر بلکہ پورے جنوبی ایشیا میں ہے۔ ان کی تعلیمات اور خیالات نے نہ صرف روحانی دنیا بلکہ ثقافتی اور سماجی زندگی میں بھی ایک گہرا اثر چھوڑا ہے۔ ان کی شاعری آج بھی مختلف ثقافتوں اور زبانوں میں پڑھائی جاتی ہیں جس سے ان کی حکمتیں اور تعلیمات نئی نسلوں تک پہنچتی ہیں۔ وہ بطور شاعرہ زیادہ معروف ومقبول ہیں یا ان کے صوفیانہ تصورات زیادہ اہمیت کے حامل ہیں اس بارے میں کچھ بھی وثوق سے نہیں کہا جاسکتا لیکن ان پر لکھنے والوں کے مختلف خیالات سے بات عیاں ہوتی ہے کہ دونوں کی اہمیت مسلم ہے۔ مثلاً پروفیسر جیالال کول نے اپنی ایک کتاب میں لکھا ہے:

''ان کے حالات زندگی سے قطع نظر جو بات یقینی طور پر کہی جاسکتی ہے، یہ ہے کہ انھوں نے اہل کشمیر خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان، امیر ہو یا غریب، خواندہ ہو یا ناخواندہ، اپنا گرویدہ بنالیا۔ ان کے کلام کا اثر سب پر گہرا اور دیرپا رہا ہے۔ وہ کشمیر کی مقبول ترین شاعرہ ہیں۔ لیکن ان کی ہر دلعزیزی کا باعث ان کے فلسفے کے دقیق حقائق کا بیان یا جنسِ نفس یا کنڈلنی اور نادِ بندیوگ کا غور وفکر نہیں۔ وہ صرف اس لیے قابل عزت واحترام نہیں سمجھی جاتیں کہ وہ شیوفلسفہ کی ترجمان ہیں۔ ان کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کا باعث ان کی شدید عقیدت، عمل، تجربہ، صدق وخلوص، بصیرت افروزی اور روحانیت سے متعلق رموز و نکات ہیں جن کو وہ شاعرانہ انداز بیان کے ساتھ ساتھ بامحاورہ اور عام فہم زبان میں ادا کرتی ہیں''[2]

آج تقریباً 600 برس کا طویل عرصہ گزر جانے کے بعد بھی لل دید کی شاعری جسے واکھ یا اقوال کہا گیا ہے، کشمیر کے مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان اتحاد و ہم آہنگی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جیسا کہ صوفی شاعر کبیر کے متعلق مشہور ہے کہ وہ اپنے اقوال دوسروں کو سنایا کرتے تھے اور وہی ان کی مقبولیت کا سبب ہیں۔ لل دید کا بھی ٹھیک یہی معاملہ تھا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کبیر کی شاعری کو دوہا اور شبد کا نام دیا گیا ہے جبکہ لل دید کی شاعری کو واکھ جسے عام طور سے واقعہ یا قول سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب شاعری کی لیے غزل، نظم وغیرہ جیسی اصناف کا وجود بھی نہ تھا اور نہ بحر و وزن کا کوئی پیمانہ تھا۔ اس لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ واکھ ہی اس دور کی عظیم شاعری تھی۔ لل دید کو اس قسم کی شاعری کا موجد نہیں کہا جا سکتا، کیوں کہ ان کے پہلے بھی کئی صوفیا حضرات اسی سرزمین میں اپنے قول و فعل کے ساتھ اپنے کشف و کرامات کا مظاہرہ کر چکے ہیں۔ لیکن لل دید کی شاعری کو یہ اعجاز حاصل ہے کہ کئی سو سالوں تک یہ سینہ بہ سینہ لوگوں میں منتقل ہوتی رہی ہے۔ ایسا اس لیے بھی تھا کہ لل دید کی اپنی زندگی میں ان کے واکھوں کا کوئی مسودہ کتابی صورت اختیار نہ کر سکا بلکہ ان کی وفات کے تقریباً ڈیڑھ دو سو سالوں تک بھی ایسا ممکن نہ ہو سکا۔

لل دید کی شاعری اور فکر کی آج کے دور میں اہمیت اس لیے بھی ہے کہ اُنھوں نے انسانیت کے بنیادی اصولوں کو بہتر انداز میں سمجھایا اور بیان کیا۔ اُن کے کلام میں محبت، اعتدال اور انسانیت کے نفاذ کی باتیں بیان ہوئی ہیں جو اُنھوں نے اپنی عملی زندگی میں بھی بروئے لائیں۔ لل دید کی شاعری زریں اقوال کی حیثیت رکھتی ہے جس کی تمام خصوصیات کو یکجا کر پانا بہت مشکل امر ہے۔ کیونکہ جس طرح کبیر اور دیگر کئی صوفی شعرا کے کلام کی آج بھی لوگ اپنے گھروں میں قرأت کرتے ہیں، ٹھیک اسی طرح لل دید کے واکھوں کی بھی اکثر لوگ قرأت کرتے آئے ہیں۔ ان کی شاعری کی ایک خصوصیت تو یہ ہے کہ انھوں نے اپنے اصولوں اور فلسفوں کو اس دور کی سادہ اور عام زبان میں لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ چونکہ اس وقت کشمیری زبان کے لیے بھی سنسکرت رسم الخط ''شادار'' مقرر تھا۔ للیشوری کے واکھ اور نندرشی کے شلوکس ہی نہیں بلکہ قدیم کشمیری ادب بھی ہمیں اسی رسم الخط میں ہی ملتا ہے۔ لیکن بعد میں جب اس زبان کا رسم الخط تبدیل ہوا تو لل دید کے کلام کو ترتیب دینے میں بہت دشواری آئی کیوں کہ ان کے واکھوں میں موجود بعض الفاظ متروک ہو چکے تھے۔ اسی لیے مرتب کرنے والوں نے ان میں موجود متروک الفاظ کی جگہ ہم معنی الفاظ شامل کر کے انھیں رہتی دنیا تک کے لیے زندہ جاوید بنا دیا ہے۔ لل دید کو اتنی شہرت ان کے علم، شاعری اور انسانی معاشرت پر مشتمل زندگی کے ذریعے حاصل ہوئی ہے۔ ان کا اصل مقصد شاعری کی تخلیق نہیں بلکہ انسانیت کی خدمت و محبت کو فروغ دینا تھا۔ اُن کی زندگی اور کلام سے بہت

''لل دید کی زندگی اور کلام ایک مثال ہیں کہ انسان اگر اپنے اصولوں پر مضبوطی سے قائم رہے، تو وہ کسی بھی مشکلات کا سامنا کر سکتا ہے اور دنیا کو اپنے عزم سے اچھائی کی جانب متوجہ کر سکتا ہے۔انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے انسانیت کے مسائل پر غور کیا، انسانی روح کی قدرتی خوبیوں کی تعریف کے ساتھ ساتھ محبت اور ہمدردی کی اہمیت پر خصوصی زور دیا ہے۔لل دید کی شاعری کا موضوع عموماً انسانیت، محبت، اور انسانی معاشرہ ہے۔ اُن کی شاعری میں دینی اور فلسفی مضامین بھی بہت ہیں۔ بعض لوگوں نے انھیں بھی کشف و کرامات کا حامل بتایا ہے''

سے سبق حاصل کیے جا سکتے ہیں، جو ہمیں ایک بہتر انسان بننے اور بہتر زندگی گزارنے کی راہ دکھائیں گے۔ یہ بات ہمیشہ یاد رہنی چاہیے کہ لل دید جیسی شخصیات ہمیں یہ سکھاتی ہیں کہ زندگی کی حقیقت اور اس کے مقاصد کو سمجھنے کے لیے خلوص و وفا، محبت و ہمدردی اور انسان دوستی جیسی صفات سے آراستہ ہوا لازمی ہے۔ایک واکھ کا مفہوم:

مورتی ہو دیوتا کی یا ہو مندر کی نمود
دونوں کی تشکیل میں پتھر ہی پتھر ہے عیاں
زیر و بالا پیش و پس پتھر ہی پتھر پائے گا
تو پرستش کس کی کرتا ہے بتا پنڈت مجھے
من کو ہاں اپنے نفس کا رات دن ہمدم بنا 3

لل دید کی زندگی اور کلام ایک مثال ہیں کہ انسان اگر اپنے اصولوں پر مضبوطی سے قائم رہے، تو وہ کسی بھی مشکلات کا سامنا کر سکتا ہے اور دنیا کو اپنے عزم سے اچھائی کی جانب متوجہ کر سکتا ہے۔انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے انسانیت کے مسائل پر غور کیا، انسانی روح کی قدرتی خوبیوں کی تعریف کے ساتھ ساتھ محبت اور ہمدردی کی اہمیت پر خصوصی زور دیا ہے۔لل دید کی شاعری کا موضوع عموماً انسانیت، محبت، اور انسانی معاشرہ ہے۔اُن کی شاعری میں دینی اور فلسفی مضامین بھی بہت ہیں۔بعض لوگوں نے انھیں بھی کشف و کرامات کا حامل بتایا ہے مثلاً مشہور عارف پنڈت پر مانند نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ ''للیشوری نے یوگ کی مشق کرتے کرتے برہمانڈ (کاسہ سر) کے بلند ترین مرکز پہ تن تنہا جگہ حاصل کی ہے۔'' 4

لل دید کشف و کرامت کو خاطر میں نہیں لاتی تھیں۔نند لال کول طالب کے ترجمہ کردہ ان دو واکھوں میں کشف و کرامت کے متعلق ان کا نظریہ اور حقیقت بیان ہوا ہے:

''بہتی ندی کو روک لینا۔شعلہ زن آگ کو بجھا دینا۔آسمان پر چلنا کاٹھ کی گائے سے دودھ لینا۔ یہ سب مکر و فریب کی چالیں ہیں، کوئی گھر بار چھوڑ دے یا صحرا نشینی سے منہ موڑ لے، جب تک من چنچل رہے گا صبر و سکون ممکن نہیں'' 5

موجودہ دور میں لل دید کے کلام کی ایک بڑی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ انھوں نے اپنے واکھوں میں عقل اور روحانیت کو ایک دوسرے کے ساتھ مربوط کر دیا ہے۔ان کی زندگی اور کلام کا وسیع ترین پیغام یہ ہے کہ اگر ہم اپنے اصولوں پر قائم رہیں، محبت اور اعتدال کے ساتھ زندگی گزاریں، اور دوسروں کی مدد کریں، تو ہم اپنی زندگی میں معنویت، امن، اور خوشی پیدا کر سکتے ہیں۔اُن کی زندگی کا پیغام ہے کہ ہم اپنے اصولوں پر قائم رہیں اور اپنے دل کی سنیں، تاکہ ہم اور ہمارے ارد گرد کا ماحول بہتر اور خوشحال ہو سکے۔اُن کی شاعری میں زندگی کے عمیق مسائل اور انسانیت کے فلسفیانہ پہلو بھی ہیں۔ وہ انسانیت کی عظمت، ذاتی خوبیوں کی قدرت اور خدا کی تلاش کے ساتھ وجود خدا کی اہمیت پر زور دیتی ہیں۔مثلاً ان کے چند واکھوں کا مفہوم دیکھیے:

''زمین تو ہے زمان تو ہے، ہوا دن رات تو ہے
چڑھاوے کا اناج اور جل بھی، چندن پھول بھی تو ہی
غرض ہر چیز میں خود سمایا ہے بہر صورت
میں حیراں ہوں کر دوں کیا تیری نذر ایسی حالت میں'' 6

''شہوت، غصہ اور حرص یہ تینوں قاتل ہیں، انھیں مار ڈال، جس نے حرص، ہوائے نفسانی اور غرور یعنی رہزنوں کو مار ڈالا اور اپنے آپ کو سب کا خدمت گزار قرار دیا۔اسی نے ایشور کی سچی تلاش کی''

''بارہا آتے رہے ہیں ہم بارہا جاتے رہے
سلسلہ یہ آنے جانے کا رہے گا برقرار
جس جگہ سے اس طرح آتے رہے ہیں پے در پے

پھر وہیں جاتے رہیں گے ہم برابر بار بار
راز ہے کوئی نہ کوئی اس میں پوشیدہ ضرور
ورنہ کیا سارا یہ ہنگامہ ہے بے اعتبار‘‘ 8

لل دید کی شاعری اور فلسفے کا ایک اور اہم پہلو ان کی تنہائی اور روحانیت ہے۔اُن کی شاعری میں اکثر تنہائی، خاموشی،اور انسان کی روح کی تلاش وغیرہ کے واضح عناصر ملتے ہیں۔ وہ انسان کی تنہائی اور خاموشی کو ایک اہم جز وتصور کرتی تھیں جو کہ انسان کو روحانیت کی توانائی اور دنیا کی حقیقت کا پتہ دیتی ہے۔ان کی شاعری میں موت اور زندگی کے موضوعات بھی بہت اہم ہیں۔ وہ انسان کو یہ بتاتی ہیں کہ زندگی کی کمی اور موت کا واقع ہونا کوئی خوفناک چیز نہیں بلکہ ایک طبعی حقیقت ہے،جس پر ہمیں زندگی کی اہمیت اور عظمت کا احساس ہوتا ہے۔ کچھ واکھوں کو نندلال کول نے شعری پیکر میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔

لل دید کی زندگی کا ایک اور اہم پہلو ان کی مذہبی تشریح اور دینی تجربات ہیں۔ ان کی شاعری میں انسانیت کے اصولوں کے ساتھ ساتھ ایک عمیق دینی پیغام بھی ہے۔ وہ انسانوں کو خدا کی تلاش، دین کی سچائی، اور روحانیت کی اہمیت پر غور کرنے کی ترغیب دیتی ہیں۔ان کی زندگی کا ایک اور مشہور پہلو اُن کی علمی فضیلت ہے۔ اُنھوں نے عرفانیات، فلسفہ،اور دین کی تعلیمات کا مشاہدہ کیا اور اپنی زندگی کو ان تجربات کے روشنی میں گزارا۔ اُن کی شاعری اور فکر میں علمی وعرفانی مفاہمت کا واضح اظہار ہے، جو ان کی شخصیت کو اور بھی اہم بناتا ہے۔ان کی زندگی کی ایک اور اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایک عورت تھیں جو اپنے وقت کے معاشرتی روایات اور پرسکون معاشرتی ماحول کے خلاف جا رہی تھیں۔ ان کی شاعری اور فکر میں عورتوں کے حقوق اور ان کی عظمت کی بھی خصوصی ترجمانی ہے۔ اُنھوں نے عورتوں کی علمی،فکری، اور روحانی قدرتوں کو بیان کیا اور ان کی عظمت کو سمجھایا ہے۔

’’عورت کی ذات دیکھیے پھر غور کیجیے
کرتی ہے والدہ کی کبھی صورت اختیار
بچے کو تب پلاتی ہے کس شوق سے وہ دودھ
آتی ہے سامنے کبھی بیوی کے روپ میں
اس وقت ہوتی ہے مگر اس کی رو کچھ اور
مایا کی شکل میں کبھی ہوتی ہے جلوہ گر
لیتی ہے جان تک کبھی اتنی ہے وہ نڈر‘‘ 9

اس مختصر مضمون میں ان کی شاعری اور فلسفہ زندگی کو مکمل بیان کر پانا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔لیکن اس بات نے مجھے شدید حیرت میں مبتلا کیا کہ ریاست جموں وکشمیر میں تقریباً گیارویں صدی عیسوی سے زبان و ادب کی ترویج عمل میں آئی ہے اور بعض زبانوں کا ایک بڑا ادبی سرمایا بھی آج ہماری نظروں میں ہے مگر لل دید کی شخصیت کے بارے میں نہ ان کے جیتے جی کسی نے تذکرہ کیا، نہ ان کی وفات کے بعد دوصدیوں تک کوئی ایسی کتاب ملتی ہے، جس میں ان کی شخصیت کا کوئی جز بیان کیا گیا ہو۔لل دید کے دور کے بڑے مورخوں میں جون راج، شری در اور یودھ بھٹ کا نام آتا ہے۔ان کی لکھی ہوئی قدیم تاریخوں میں بھی لل دید کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ جبکہ ان کی وفات کے دوصدیوں بعد آنے والے مؤرخوں میں خواجہ اعظم دیدہ مری، پنڈت بیربل کاچرو، پیر غلام محمد کھویہامی وغیرہ نے ان کا نام بڑے ادب و احترام کے ساتھ اپنی تاریخی کتب میں شامل کیا ہے۔ یہاں سے ایک طویل سلسلہ جو تاریخ رشیدی، واقعات کشمیر، تاریخ کشمیر اور اسرار لال ابرار سے شروع ہوا اور آج بھی جاری وساری ہے۔آج لل دید کی شخصیت ریاست جموں وکشمیر یا برصغیر ہندو پاک ہی نہیں بلکہ پورے ایشائی ویورپی ممالکوں میں کسی تعارف کی محتاج نہیں رہے۔

1 (Reza ,Arif, Lal Ded(English), Harpercollins ,india, 2011, page No: 3)
2 (کول، پروفیسر جیالال، جموں وکشمیر کلچرل اکادمی، سرینگر،1984،ص:13)
3 (طالب، نندلال کول،لل دید، جے کے آفسیٹ پرنٹرس، دہلی،1993،ص:138)
4 (ایضاً ص:32)
5 (طالب، نندلال کول،لل دید، جے کے آفسیٹ پرنٹرس، دہلی،1993 ،ص:35،45)
6 (ایضاً ص:143)
7 (ایضاً ص:43)
8 (ایضاً ص:69)
9 (ایضاً ص:155)

□□□

Dr Rakesh kumar
Assistant Professor
Department of Urdu
University of Kashmir
Email: rakeshjnu000@gmail.com
Mobile: 9682562091

سیدہ انجم آرا

ناولٹ 'چائے کے باغ'
ایک جائزہ

'قرۃ العین حیدر کا یہ ناولٹ کئی اعتبار سے بڑی اہمیت کا حامل ہے انہوں نے اس چھوٹے سے کینوس پر زندگی کی بڑی وسیع عکاسی کی ہے۔ قرۃ العین نے "چائے کے باغ" میں بہت سے کرداروں کو پیش کیا ہے جیسے راحت کاشانی، فرحت کاشانی، صنوبر، شمشاد، قاسم، واجد، زرینہ، ارسلان، غفور میاں، پارھتی وغیرہ، ہر کردار منفرد ہے اور قاری کے ذہن پر بہت گہرا اثر چھوڑتا ہے اس کے علاوہ اور بھی چھوٹے بڑے کردار ہیں جن کی اہمیت اور انفرادیت سے ناولٹ کا تاثر گہرا ہوتا ہے اور ان تمام کرداروں کے ساتھ کئی مسائل ہیں جن کو فنکارانہ خوبیوں سے نمایاں کیا گیا ہے اور ایسے مظلوم اور دکھ بھرے لوگوں کی داستان، عورت کی سماجی حیثیت اور اس کی بے بسی کو قرۃ العین نے "چائے کے باغ ناولٹ میں بیان کیا ہے۔ جن پر کم تخلیق کاروں نے قلم اٹھایا ہے۔'

قرۃ العین حیدر نے اپنا تخلیقی سفر 1936 کی ترقی پسند تحریک سے شروع کیا۔ یہ دور کئی اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے قرۃ العین اعلی تعلیم و تربیت صحت منداور شاندار ادبی روایات کے پس منظر میں اردو ادب میں داخل ہوئیں۔ انھوں نے مغربی ادب کا گہرائی و گیرائی کے ساتھ مطالعہ کیا جس کی وجہ سے ناولوں کا کینوس کو وسیع تر کر دیا۔

اگر چہ ناولٹ کی صنف مغرب سے اردو میں آئی لیکن اس صنف کے فنی خصائص کے لیے اُردو ناول کی تخلیقی روایات زیادہ مددگار ثابت ہوئی۔ اس کے علاوہ اردو ناولٹ نگاروں نے مغربی فکشن کی بدلتی ہوئی تکنیکی اور صحیح روایات کو بھی اپنے ناولٹ میں استعمال کیا اور شعور کی رو" کی تکنیک کو پہلی بار کامیابی سے برتنے کی کوشش کی۔ قرۃ العین حیدر کے ناولٹ بھی ہئیتی لحاظ سے تکنیک کے نئے پن کا پتہ دیتے ہیں۔ قرۃ العین نے جہاں پیش رو اُردو فکشن کی تخلیقی روایت سے استفادہ کیا ہے وہیں جدید انگریزی فکشن کی تخلیقی روایات کو بھی جذب کیا ہے۔

قرۃ العین حیدر کا یہ ناولٹ کئی اعتبار سے بڑی اہمیت کا حامل ہے انھوں نے اس چھوٹے سے کینوس پر زندگی کی بڑی وسیع عکاسی کی ہے۔ قرۃ العین نے "چائے کے باغ "میں بہت سے کرداروں کو پیش کیا ہے جیسے راحت کاشانی، فرحت کاشانی، صنوبر، شمشاد، قاسم، واجد، زرینہ، ارسلان، غفور میاں، پارھتی وغیرہ، ہر کردار منفرد ہے اور قاری کے ذہن پر بہت گہرا اثر چھوڑتا ہے اس کے علاوہ اور بھی چھوٹے بڑے کردار ہیں جن کی اہمیت اور انفرادیت سے ناولٹ کا تاثر گہرا ہوتا ہے اور ان تمام کرداروں کے ساتھ کئی مسائل ہیں جن کو فنکارانہ خوبیوں سے نمایاں کیا گیا ہے اور ایسے مظلوم اور دکھ بھرے لوگوں کی داستان، عورت کی سماجی حیثیت

اور اس کی بے بسی کو قرۃ العین نے "چائے کے باغ ناولٹ میں بیان کیا ہے۔ جن پر کم تخلیق کاروں نے قلم اٹھایا ہے۔

تقسیم ملک کے بعد کے مسائل، نئے دولت مند طبقے کا ابھرنا، زندگی کے اہم اقدار کا زوال، نفسیاتی الجھن، امیر اور غریب طبقے کی زندگیوں کی دوری، سرحد کی تقسیم سے دلوں کی تقسیم کی ناکام کوشش، مغربی پاکستان والوں کی بنگال کے عوام سے بے تعلقی ان سارے مسائل کا احاطہ جس فنکارانہ حسن کے ساتھ کیا ہے، وہ اس ناول کو گراں قدر بناتا ہے۔

پیش نظر اس ناولٹ کی تکنیک بھی اچھوتی ہے اس لیے شاید اس مختصر سے ناولٹ میں انھوں نے زندگی کے کئی شیڈس پیش کیے ہیں۔ اس ناول میں ہمیں غزل کا اختصار بھی ملتا ہے اور اس کی سادگی اور پرکاری بھی۔

قرۃ العین نے "چائے کے باغ''میں بہت سے کردار اور بے شمار واقعات اور زندگی کے مختلف گوشے سمیٹ لیے ہیں۔ اس ناولٹ میں خود ناول نگار شروع سے آخر تک موجود ہے اس کی اپنی کہانی اس قدر ہے کہ وہ مغربی پاکستان سے سابق مشرقی پاکستان یعنی بنگلہ دیش ڈاکومنٹری فلم بنانے کے لیے بھیجی جاتی ہے اور یہاں مختلف واقعات اس کے سامنے آتے ہیں۔ دوسرا کردار زرینہ کا ہے جو خود بھی اس ناولٹ کی قصہ گو ہے۔ وہ ڈاکٹر ہے اور ارسلان سے (جو چائے کے باغ میں بڑا افسر ہے) اس کی شادی کر دی جاتی ہے۔ زرینہ اور ارسلان شادی کے بعد باوقار زندگی بسر کرتے ہیں۔

زرینہ کے برعکس راحت کا شانی اور صنوبر کے کردار میں ان کی کہانیاں اور ان سے وابستہ شمشاد قاسم اور واجد کی کہانیاں ہیں اور یہاں غریب طبقے کے کرداروں کی بھی جھلک ملتی ہے۔ جس میں غفور میاں اور پاریتی کی محبت کی کہانی شامل ہے۔ یہ کہانی اس وقت ہی شروع ہوتی ہے جب ناول نگار اسٹیشن پر ایک امریکن اور اس کی میم کو دیکھتی ہیں اور پھر جب ناول نگار کی ملاقات ان سے کلب میں ہوتی ہے۔ یہاں پر اس کی بہن اور سہیلی زرینہ کو اس میم کے تعلق سے کچھ شک ہوتا ہے کہ یہ عورت امریکن نہیں ہے اور جب اس میم سے نام پوچھا جاتا ہے تو وہ ریٹائر فریزر بتلاتی ہے۔ تب بھی زرینہ کو شک ہوتا ہے اور کہتی ہے کہ یہ جھوٹ کہہ رہی ہے۔ یہ آج تک امریکہ گئی ہی نہیں۔ اس طرح سے اہم کردار راحت کا شانی سے قاری کا تعارف ہوتا ہے لیکن زرینہ جو اس ناولٹ کی قصہ گو بھی ہے جب اپنی داستان شروع کرتی ہے تو فلیش بیک سے کام لیتی ہے جبکہ ابتدا میں راحت کا شانی کا کہیں ذکر نہیں آتا بلکہ صنوبر کی زندگی کی کہانی میں اس کی شادی شمشاد سے ہوتی ہے۔ ملک تقسیم ہو جانے کے بعد یہ تینوں ڈھا کہ منتقل ہو جاتے ہیں شمشاد کے ساتھ اس کے دونوں دوست بھی رہتے ہیں۔ صنوبر ایک سیدھی سادی لڑکی ہے۔ شمشاد کی غیر موجودگی میں قاسم اور صنوبر ایک دوسرے کے قریب آ چکے تھے حالانکہ صنوبر شمشاد کے بچے کی ماں تھی پھر بھی ان حالات کی وجہ سے وہ شمشاد سے طلاق لے لیتی ہے اور اپنے بچے کے لیے تڑپتی رہتی ہے مگر واجد ہمیشہ صنوبر کو تسلی دیتا ہے۔ یہ کہہ کر کہ تم اپنی کشتیاں جلا چکی ہو اب تم قاسم سے لڑائی مت کرنا اور نہ تم کہیں کی نہ رہو گی اس کے علاوہ وہ اپنے دو لڑکیوں کو لے کر خوشحال زندگی گزارنے لگتی ہے۔

راحت کا شانی کی مخصوص زندگی اپنے ماحول اور پس منظر میں ایک المیہ ہے راحت نے واجد سے قریبی تعلقات قائم کیے مگر جب سوال شادی کا آیا تو واجد نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے۔ اس نے اپنا مستقبل بنانے کے لیے ایک نواب زادے سے شادی کی۔ اس نے بھی چار دن کے بعد طلاق دے دی۔ اس کے بعد غیاث الدین سے شادی کی، اس نے بھی اس کو چھوڑ دیا۔ وہ ایک شریف خاندان کی خاتون کی طرح زندگی گزارنے کی آرزومند تھی لیکن حصول زر کے لیے فلم انڈسٹری کا رخ کرتی ہے لیکن اسے وہاں بھی ناکامی حاصل ہوتی ہے۔ اس طرح اس کردار سے ہمیں ایک ہمدردی ہونے لگتی ہے مگر اس نے بعض ایسی حرکتیں بھی کیں جو نہیں کرنا چاہیے یعنی جیسے مسٹر فریزر کو دھوکہ دے کر اس نے ہر

برٹ کو اپنایا اور اسی نتیجے میں ہربٹ کا قتل کر دیا گیا۔

قرۃ العین حیدر نے ہماری موجودہ زندگی کے تلخ حقائق کو بے حد فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے اور سچ پوچھیے تو بڑا ہی واضح اور اہم اخلاقی سبق بھی دیا ہے۔ اس سبق کو پانے کے لیے تحلیل اور تجزیہ کی ضرورت ہے۔ جیسا کہ فرانک لوٹیں نے کہا ہے کہ "ہر ناول کا کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا ہے لیکن اچھا ادب مقصد پن کا شکار نہیں ہوتا"۔ اس کا کہنا ہے کہ ہر ناول/ ناولٹ تین باتوں میں سے کسی ایک بات کی وضاحت لازمی طور پر کرتا ہے۔

1) یا تو کوئی بات بیان کرتا ہے۔

2) یا کسی چیز یا بات کو پیش کرتا ہے یا دکھاتا ہے۔

3) یا کوئی بات ثابت کرتا ہے معمولی ناول میں کسی چیز کا بیان ملتا ہے۔ اس سے بہتر ناول کسی چیز کو دکھاتا ہے کسی بات کی وضاحت کرتا ہے۔

"چائے کے باغ" ناولٹ میں یہ تینوں باتیں ملتی ہیں۔ قرۃ العین حیدر کے اس ناولٹ کا سب سے اہم اور نمایاں پہلو وقت ہے۔ انھوں نے ان تمام کرداروں کے علاوہ ایک اور اہم کردار وقت کو بہت ہی خوبی کے ساتھ اور اچھوتے انداز میں پیش کیا ہے۔ وقت صرف ماضی سے مستقبل کی طرف رواں رہتا ہے۔ وقت کے تسلسل کے ساتھ تمام چیزیں ماضی سے مستقبل کی طرف حرکت کرتی ہیں۔ وقت کی فعالیت اور وقت کی جبریت قرۃ العین حیدر کا پسندیدہ موضوع رہا ہے۔

کیا "چائے کے باغ" کے سارے کردار وقت کے ہاتھوں کھلونا نہیں بنے ہوئے ہیں؟ کیا یہ کہانی وقت کے ساتھ بدلتے ہوئے بنگال ڈھاکہ کی سماجی و تہذیبی تبدیلیوں کے ذریعے راحت کاشانی کی زندگی کی تبدیلیوں کا اظہار ہیں؟ ۔۔۔۔ غرض یہ کہ قرۃ العین نے وقت کے کردار کو نمایاں طور پر پیش کیا ہے۔ اسی طرح سے انھوں نے "چائے کے باغ" میں ایک کمزور عورت کو پیش کیا جسے معاشرے میں اپنی شناخت بنانے کے لیے کن کن منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ زندگی کی چھوٹی چھوٹی آسائشوں کی تلاش اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیتی ہے۔ ان سب کو قرۃ العین نے بڑے موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ حاصل لا حاصل کی یہ کہانی ہر اس محمودہ کا منظر نامہ ہے جو ریٹا یا راحت کاشانی کا لبادہ اوڑھنے کے باوجود محمودہ رہتی ہے۔ ایک غریب مولوی عبدالصمد کی لڑکی جس کو خود فریبی اور فرار مسلسل کے عوض میں کیا ملا چند آنسو جو تحریر کی سیاہی پر نہیں اس کی ساری زندگی پر بھاری ہیں۔ خط پر ٹپکے ہوئے یہ چند آنسو اس کی تنہائیوں اور محرومیوں کی روداد ہیں جس میں وہ ایک چھوٹے سے درخت کی طرح بڑے درختوں کے درمیان اکیلی اور بہت اکیلی ہے یہ صرف راحت کی تنہائی نہیں بلکہ صنوبر کی بھی تنہائی ہے۔

اسی طرح پاربتی، رام نندن، غفور الرحمن اور بہت سارے لوگ ہیں جن کو وقت اور حالات نے سونار بنگلہ کی سرزمینوں پر پھینکا ہے۔ راحت کی تنہائی ہو یا صنوبر دونوں اپنے انتخاب اور آزادی کی وجہ سے اکیلی ہیں۔ راحت اپنی ساری ذہانت اور حسن کے باوجود کچھ تو اس کے محبوب کے غلط رویوں اور وقت کے تھپڑوں کے سبب بھٹک رہی ہے تو صنوبر اپنے بھولے پن اور محبت کی شدت کی وجہ سے بھٹکتی ہے۔ ان دونوں کی تنہائیوں میں جہاں خود ان کا ہاتھ ہے وہیں مردوں کے غلط رویوں نے انھیں مزید بھٹکا دیا ہے۔ غرض یہ کہ سونار بنگلہ کی خوبصورت فضاؤں میں ڈولتی یہ کہانی زندگی کے اتنے رنگ سمیٹے ہوئے ہے کہ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ کون سا رنگ کتنا خوبصورت ہے؟

اس ناولٹ میں طنز یہ اسلوب نہایت بھرپور ہے اور کہیں تو اس کی دھار جسم سے روح تک شگاف ڈال دیتی ہے۔ مندرجہ ذیل اقتباس سے غفور الرحمن کے کردار پر روشنی پڑتی ہے۔

> "یہ شخص غفور الرحمن میاں بوکا ننگا فاقہ کش ملاح اور اس کے فاقہ کش ماں باپ اور بہن بھائی صرف اتنا جانتے ہیں کہ ملکوں کے بیچ میں دیواریں کھڑی ہیں مگر دکھ کی کوئی سرحد نہیں ہے وہ یہ تک نہیں جانتے تھے کہ ان کا بانس کا جھونپڑا اور اناس اور دھان کا کھیت تھا جہاں پرکھوں کے کیا زمانے سے رہتے آئے تھے اور اب وہ ان کا نہیں"۔

بہر حال قرۃ العین حیدر نے اپنے اس ناولٹ میں ایک اچھوتے تکنیکی انداز کے ذریعے عورت کی بے کسی کو جس تناظر میں پیش کیا ہے وہ نہایت ہی موثر اور دلچسپ ہے بلکہ اس کی ایک علیحدہ شناخت بھی بن جاتی ہے۔ اس طرح نسوانی کردار زیادہ ہیں جو ہندوستانی عورت کی نمائندگی کرتے ہیں اور اپنی انفرادیت بھی قائم رکھتے ہیں۔

❑❑❑

Dr. Syeda Anjum Ara
C/o S.Z. Hussaini,
H.No. 5-4-51,
Mohella Maniyar Taleem, Bidar
Near Sultan Pharmacy College
Bidar-9880458671 (K.S.)
Mob: 9880458671

ہما

حسین الحق

حیات و خدمات

بیسویں صدی کے آخر میں جن مصنفین نے اپنی کہانیوں کے ذریعے معاشرے میں ہونے والی نئی تبدیلیوں سے ہمیں متعارف کرایا ان میں ایک اہم نام حسین الحق کا ہے۔ اردو ادب کی تاریخ میں ان کی حیثیت فکشن نگار، نقاد، محقق اور مصنف کی تھی۔

لیکن اُردو ادب میں حسین الحق فکشن نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ بنیادی طور پر وہ افسانہ نگار تھے لیکن بہ حیثیت ناول نگار بھی ان کی انفرادیت مسلم ہے۔ ان کی شخصیت کے تمام پہلو ان کے افسانوں اور ناولوں میں بہ خوبی نظر آتے ہیں۔ بقول وہاب اشرفی

''حسین الحق صاحب کے پاس روایات کا خزانہ ہے اور وہ انھیں عہد جدید کے Relevant بنا کر پیش کرتے ہیں۔ مذہب ان کی تربیت کا پس منظر ہے۔''

(وہاب اشرفی: تاریخ ادب اردو، جلد سوم، ص:1345)

وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ:

''حسین الحق کے یہاں حق و باطل کی کشمکش ایک خاص موضوع ہے۔ یوں بھی اپنی گفتگو میں وہ ایسے موضوعات چھیڑتے رہتے ہیں لیکن یہ کشمکش تو ازلی ہے لیکن حسین الحق اسے حالات حاضرہ پر منطبق کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ کوئی بھی تاریخی واقعہ نئے منظر نامے کا جز بن جاتا ہے اس لیے یہ کشمکش Unending ہے۔''

(وہاب اشرفی: تاریخ ادب اردو، جلد سوم، ص:1345)

حسین الحق کا اصل نام حسین الحق، تاریخی نام وسیع بخت ریزہ اور شاعری میں حسین تخلص کرتے تھے۔ حسین الحق کی پیدائش 2/ نومبر 1949 کو اپنے نانیہال محلّہ املی آدم خاں سہسرام، بہار میں ہوئی۔ ان کا خاندان ایک بڑا علمی اور صوفی خاندان تھا۔ حسین الحق کے والد مولانا انوارالحق شہودی نازش سہسرامی خود ایک مشہور عالم دین، ادیب، خطیب، شاعر، مقرر، نثر نگار اور صوفی تھے۔ ان کی والدہ کا نام محترمہ شوکت آرا تھا جن کا تعلق بھی سہسرام سے ہی تھا۔ حسین الحق کی شادی سید محمد اسرارالحق کی صاحبزادی نشاط آرا سے ہوئی اور اللہ نے انہیں دو بیٹوں اور دو بیٹیوں سے نوازا۔

حسین الحق نے اپنی ابتدائی تعلیم کا آغاز اپنے والد کی زیر نگرانی خانوادے کی روایت کے مطابق دینی تعلیم سے کیا۔ حسین الحق کے والد نے ان کی ذہنی کیفیت کو مذہب و تصوف سے ہم آہنگ کیا اور والدہ شوکت آرا نے انھیں ادب کی طرف مائل کیا۔ اس کے بعد انھوں نے مدرسہ کبیر یہ سے مولوی کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد آرا ضلع اسکول آرا سے 1963 میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ 1968 میں ایس پی جین کالج سے گریجویشن

کی ڈگری حاصل کی اور یونیورسٹی میں اوّل آئے۔ آگے کی تعلیم جاری رکھنے کے لیے پٹنہ یونیورسٹی کا رُخ کیا اور پٹنہ یونیورسٹی سے ہی 1970 میں اردو میں ایم۔اے کیا اور اس میں بھی اوّل آئے۔ 1972 میں مگدھ یونیورسٹی بودھ گیا سے فارسی میں ایم۔اے کیا۔ اس کے بعد ملازمت اختیار کی۔ اسی دوران انھیں یو۔جی۔سی سے جونیئر فیلوشپ ملی اور 1974 تک ریسرچ فیلو کی حیثیت سے پٹنہ یونیورسٹی میں تحقیقی وتدریسی کاموں میں مصروف رہے۔

حسین الحق کی پہلی تقرری بحیثیت لیکچرار ایس۔پی کالج، دمکا جھارکھنڈ میں ہوئی۔ لیکن انھوں نے یہاں سے استعفیٰ دے دیا۔ اس کے بعد 1976 میں ان کی تقرری گیا کالج، گیا میں بحیثیت لیکچرار عمل میں آئی۔ 1981 میں شعبۂ اردو پوسٹ گریجویٹ'' مگدھ یونیورسٹی بودھ، گیا میں ان کا تبادلہ ہوگیا۔ مگدھ یونیورسٹی بودھ گیا سے ہی صدر شعبہ کی حیثیت سے 2014 میں سبکدوش ہوئے۔ ان کی زیرِ نگرانی میں 16 ریسرچ اسکالرز نے پی ایچ۔ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ ملازمت کے دوران ان کا کنبہ سہسرام سے گیا، نیوکریم گنج آکر آباد ہوگیا تھا لیکن اپنے آبائی وطن سے ان کا رشتہ ہمیشہ برقرار رہا۔ حسین الحق نے ''اردو افسانوں میں علامت نگاری'' کے موضوع پر 1985 میں پروفیسر فصیح ظفر کی نگرانی میں پی ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

پروفیسر حسین الحق نے اپنے ادبی سفر کا آغاز تقریباً نو۔دس برس کی عمر میں ہی اپنے والد کی رہنمائی میں کیا تھا۔ ان کی پہلی کہانی ''عزت کا انتقال'' غالباً 65-1964 میں ماہنامہ کلیاں لکھنؤ میں صوفی بلیاوی کے نام سے شائع ہوئی اور اسی زمانے میں ان کا پہلا افسانہ ''پسند'' ماہنامہ ''جمیلہ'' دہلی سے شائع ہوا۔ 1966 میں انھوں نے بچوں کا ایک رسالہ ''انوارِ صبح'' سہسرام سے نکالا۔ 1969 میں ان کا پہلا مضمون بعنوان ''اُردو شاعری پر گاندھی جی کے اثرات'' بہار کی خبریں پٹنہ سے شائع ہوا۔ اس کے علاوہ سو سے زیادہ غزلیں اور نظمیں بھی لکھیں۔ پہلی نظم 1982 میں ''صبحِ نو'' پٹنہ سے شائع ہوئی۔

اپنے طویل ادبی سفر میں حسین الحق نے جو عظیم کارنامے انجام دیے، ان میں سات افسانوی مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں جو درج ذیل ہیں۔ ''پس پردۂ شب'' ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے جو 1981 میں شائع ہوا جس میں تقریباً 17 افسانے شامل ہیں۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے ان کے افسانوی مجموعے شائع ہوئے۔ ''صورتِ حال'' ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ ہے جو 1982 میں شائع ہوا۔ اس میں دس افسانے شامل ہیں۔ ''بارش میں گھرا مکان'' تیسرا افسانوی مجموعہ ہے جو 1984 میں اور ''گھنے جنگلوں میں'' چوتھا افسانوی مجموعہ ہے جو 1989 میں شائع ہوا جس میں 9 افسانے ہیں پانچواں مجموعہ ''مطلع'' جو 1995 میں شائع ہوا جس میں تقریباً 16 افسانے شامل ہیں۔ چھٹا مجموعہ ''سوئی کی نوک پر رکا لمحہ'' 1997 میں جس میں 9 افسانے ہیں۔ ساتواں اور آخری افسانوی مجموعہ ''نیو کی اینٹ'' ہے جو 2010 میں شائع ہوا جس میں 20 افسانے شامل ہیں۔ یہ ساتوں افسانوی مجموعے حسین الحق کے وہ افسانوی مجموعے ہیں جن کو اردو ادب کا نایاب اور بیش قیمتی سرمایہ کہا جاسکتا ہے۔

> **''حسین الحق کے افسانے اُردو فکشن کی آبرو قرار دیے جاسکتے ہیں انھوں نے جس دور میں افسانے لکھے وہ جدیدیت کا دور تھا اور اس دور میں نئے نئے تجربے ہو رہے تھے۔ علامت نگاری کا بول بالا تھا، شعور کی رو تکنیک کے ساتھ کہانیاں لکھنا ایک فیشن بن گیا تھا۔ حسین الحق نے بھی اس رجحان اور رویّے کو اپنایا اور اس ڈھنگ سے اپنایا کہ دیکھتے ہی دیکھتے جدید افسانوی دنیا میں ان کا نام اہمیت کا حامل بن گیا۔ انھوں نے اپنے منفرد اسلوب وزبان سے اپنی فکشن فہمی کا ثبوت پیش کیا۔ انھیں اردو افسانوں میں الفاظ کے انتخاب اور جملوں کی تخلیق کی وجہ سے اپنے ہم عصروں میں سبقت حاصل ہے۔ ان کا لب ولہجہ اور اندازِ بیان جدید افسانہ نگاری میں ایک منفرد مقام رکھتا ہے۔''**

حسین الحق کے افسانے اُردو فکشن کی آبرو قرار دیے جاسکتے ہیں انھوں نے جس دور میں افسانے لکھے وہ جدیدیت کا دور تھا اور اس دور میں نئے نئے تجربے ہو رہے تھے۔ علامت نگاری کا بول بالا تھا، شعور کی رو تکنیک کے ساتھ کہانیاں لکھنا ایک فیشن بن گیا تھا۔ حسین الحق نے بھی اس رجحان اور رویّے کو اپنایا اور اس ڈھنگ سے اپنایا کہ دیکھتے ہی دیکھتے جدید افسانوی دنیا میں ان کا نام اہمیت کا حامل بن گیا۔ انھوں نے اپنے منفرد اسلوب وزبان سے اپنی فکشن فہمی کا ثبوت پیش کیا۔ انھیں اردو افسانوں میں الفاظ کے انتخاب اور جملوں کی تخلیق کی وجہ سے اپنے ہم

عصروں میں سبقت حاصل ہے۔ ان کا لب ولہجہ اور اندازِ بیان جدید افسانہ نگاری میں ایک منفرد مقام رکھتا ہے۔

''فرات'' حسین الحق کا دوسرا ناول ہے جو 1992 میں شائع ہوا۔ 296 صفحات پر مشتمل وسیع کینوس کا ناول ہے۔ اس ناول میں حسین الحق نے یہ بتایا ہے کہ کس طرح سے ذہنی، جذباتی اور اخلاقی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ حسین الحق کا یہ ناول اپنے اسلوب اور موضوع کے لحاظ سے منفرد ہے۔ اس ناول میں نسلوں کے تصادم کو بڑی کامیابی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ یہ ایک کرداری ناول ہے اس ناول کا مرکزی کردار 'وقار احمد' ہے جس کی ساری زندگی مجاہدے میں گزرتی ہے۔ ناول فرات کو مصنف نے مرکزی کردار 'وقار احمد' کے وسیلے سے پانچ نسلوں پر مشتمل کر کے قاری کے سامنے ایک سچی اور حقیقی کہانی پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔''

حسین الحق نے مختلف موضوعات پر کہانیاں لکھیں جو قابلِ قدر ہیں۔ ان کے افسانوں میں موضوعاتی اور اسلوبیاتی دونوں سطح پر نیا پن دیکھنے کو ملتا ہے۔ حسین الحق نے عوامی زندگی کے مسائل اور معاشرے کے اتھل پتھل کو بغور دیکھا محسوس کیا اور پھر ان کو فنکارانہ طور پر اپنے افسانوں کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ حسین الحق نے اپنے مخصوص اندازِ بیان اور فکر کی جدّت سے اُردو افسانے کو ایک نئی شکل عطا کی۔

حسین الحق کے افسانے کے حوالے سے عبدالرحیم لکھتے ہیں:

''حسین الحق نے اپنے افسانوں میں علامت، تمثیل، اساطیر اور ایہام سبھی کو برتا ہے۔ لیکن کہانی سے وہ اپنا رشتہ کبھی نہیں توڑتے۔ نئی تکنیک اور نئے تجربے کے باوجود ان کی کہانی گنجلک نہیں ہوتی۔ انھوں نے طویل اور مختصر دونوں طرح کے افسانے تحریر کیے ہیں۔ نئے تجربے کے ساتھ کہانی کو برقرار رکھا۔ یہی حسین الحق کا کمال ہے اور یہی ایک بڑے افسانہ نگار اور فنکار کی پہچان بھی ہوتی ہے''۔

(عبدالرحیم: حسین الحق کے افسانے: ایک تنقیدی نظر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی)

افسانے کے ساتھ ساتھ حسین الحق نے ناول نگاری میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ حسین الحق بنیادی طور پر افسانہ نگار تھے لیکن بہ حیثیت ناول نگار بھی ان کی انفرادیت مسلم ہے۔ وہ جتنے کامیاب افسانہ نگار تھے اتنے ہی کامیاب ناول نگار بھی تھے۔ ان کے تین ناول منظر عام پر آئے جو اردو ناول کے سرمائے میں ایک گراں قدر اضافے کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان کا پہلا ناول ''بولو مت چپ رہو'' 1990 میں شائع ہوا۔ آج کی دنیا میں تعلیم کی اہمیت وضرورت پر مبنی ان کا یہ ناول اردو ادب کو ان کی فکر انگیز دین ہے۔ اس ناول میں حسین الحق نے آزادی کے بعد تعلیمی نظام میں آنے والی تبدیلیوں کو رونما کیا ہے کہ کس طرح سے شاہی افسر نے اس مقدس پیشے سے وابستہ افراد کی عزت سے کھلواڑ کیا اور اس کے ساتھ ہی نسلیوں کی تحریک کو پیش کیا۔ اس ناول میں ہندوستان کے تعلیمی نظام کی بھرپور عکاسی دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار ہیڈ ماسٹر افتخار الزماں ایک ایسا کردار ہے جو تعلیمی نظام کو بہتر بنانے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔

''فرات''، حسین الحق کا دوسرا ناول ہے جو 1992 میں شائع ہوا۔ 296 صفحات پر مشتمل وسیع کینوس کا ناول ہے۔ اس ناول میں حسین الحق نے یہ بتایا ہے کہ کس طرح سے ذہنی، جذباتی اور اخلاقی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ حسین الحق کا یہ ناول اپنے اسلوب اور موضوع کے لحاظ سے منفرد ہے۔ اس ناول میں نسلوں کے تصادم کو بڑی کامیابی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ یہ ایک کرداری ناول ہے اس ناول کا مرکزی کردار 'وقار احمد' ہے جس کی ساری زندگی مجاہدے میں گزرتی ہے۔ ناول فرات کو مصنف نے مرکزی کردار 'وقار احمد' کے وسیلے سے پانچ نسلوں پر مشتمل کر کے قاری کے سامنے ایک سچی اور حقیقی کہانی پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

مرکزی کردار ''وقار احمد'' پٹنہ یونیورسٹی کا طالب علم ہے۔ کلیم عاجز جیسے استاد کی صحبت میں تعلیم حاصل کرتا ہے۔ ایم۔ اے کرنے کے بعد نوکری لگ جاتی ہے۔ اپنی محنت ولگن سے ترقی کرتے ہوئے وہ اعلیٰ مقام حاصل کرتا ہے اور پرانی بستی کو خیر آباد کہہ کر شہر کی ایک پوش کالونی میں ذاتی مکان سہسرام ہاؤس بنواتا ہے۔ یہاں دو نسلوں اور دو تہذیبوں کے تضاد و تصادم رونما ہوتے ہیں۔ ناول کے متعلق انور پاشا معاصر اردو افسانے کے تہذیبی وسماجی سروکار کتابی سلسلہ 'نیا سفر دہلی' میں اس طرح رقمطراز ہیں:

''حسین الحق کا فرات معاصر ناول میں موضوعی اعتبار سے قدرے الگ جہتیں رکھتا ہے یہ ناول جزیشن گیپ (Generation Gap) اور بدلتے تہذیبی، معاشرتی اقدار سے پیدا شدہ صورتِ حال کو موثر انداز میں لاتا ہے۔ تین نسلوں کے درمیان موجود ذہنی اور معاشرتی تہذیبی واخلاقی قدروں کے تصادم سے ناول کا ہیولیٰ تکمیل پاتا ہے۔ زبان واسلوب میں رچاؤ اور چاشنی بیانیہ کو تازگی عطا کرتی ہے''۔

(مضمون، حسین الحق : فکشن کے ایک روشن باب کا خاتمہ، از محمد شارب، ماہنامہ اردو دنیا، فروری 2023 ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی)

اس ناول پر حسین الحق کو بہار اردو اکادمی نے انعام سے نوازا۔ اماوس میں خواب، ممتاز ناول نگار حسین الحق کا آخری اور تیسرا اہم ناول ہے جو 2017 میں شائع ہوا۔ 338 صفات پر مشتمل ایک ضخیم ناول ہے۔ آزادی کے بعد مسلمانوں کے سیاسی وسماجی اور اقتصادی زندگی کی ترجمانی حسین الحق نے اپنے اس ناول میں بہ خوبی کی ہے۔ اس ناول پر حسین الحق کو 2020 میں ساہتیہ اکادمی انعام سے نوازا گیا۔

ناول اماوس میں خواب حسین الحق کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔ حسین الحق نے اس پورے ناول میں کئی طرح کا اسلوب اختیار کیا ہے کہیں ان کا بیانیہ علامتی ہے تو کہیں ان کے بیانیہ میں رومانیت کا بھی اظہار ہوا ہے۔

حسین الحق نے ناول اورافسانوں کے علاوہ تاریخ وتنقید اور مذہب پر بھی کتابیں لکھی ہیں جن میں ''آثارِ بغاوت''۔1857 کی پہلی جنگ آزادی میں قاضی علی حق کی شرکت کا تذکرہ، ''اُردو فکشن ہندوستان میں'' تنقیدی مضامین۔ اس کتاب میں پندرہ مقالے ہیں اور ہر مقالے کا موضوع الگ ہے، ''تفہیم و تصوف''، ''آداب حج'' اور ''زیارت''۔ مذہبی کتاب ہے۔ ''آثار حضرت وحید''، ''نثر کی اہمیت''، اور ''آخری گیت'' کے عنوان سے انھوں نے ایک طویل نظم بھی لکھی ہے۔ ''غیاث الطالبین'' تصنیف حضرت مولانا غیاث الدین اصدقی، ''فوز وفلاح کی گمشدہ کڑی'' تصنیف مولانا انوار الحق شہودی، ''شرف آدم کا نقطۂ عروج'' تصنیف مولانا انوار الحق شہودی کی از سرِ نو تالیف وتدوین کی۔

مختصر یہ کہ حسین الحق 1960 کے بعد سامنے آنے والے فکشن نگاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ انھوں نے فکشن نگاروں کی بھیڑ میں اپنی ایک الگ شناخت قائم کی۔ اپنے منفرد اسلوٗب کی بنا پر ان کی ادبی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ساہتیہ اکادمی ایوارڈ، غالب ایوارڈ اور بہار اردو اکیڈمی ایوارڈ پانے والے مشہور ومعروف فکشن نگار 23 دسمبر 2021 کو 72 سال کی عمر میں کینسر کی وجہ سے پٹنہ کے میدانتا اسپتال میں جمعرات کے دن صبح تقریباً 9 بجے انتقال کر گئے اور بعد نمازِ جمعہ آبائی وطن سہسرام میں ہی سپرد خاک ہوئے۔

Huma

Research Scholar

Dept. of Urdu

Aligarh Muslim University

Aligarh-202001 (U.P)

Mob: 8791583573

E-mail: humafareed407@gmail.com

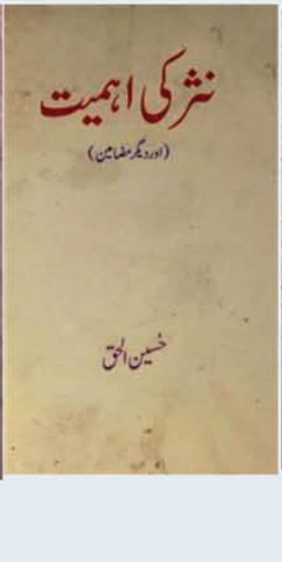

شنا

سائنسی و تکنیکی ترقیات، تہذیبی انحطاط اور معاصر اردو غزل

(ایک اجمالی جائزہ)

"انسان نے ان مشینوں کے ذریعہ اپنی زندگی میں آسانی پیدا کی ہے وہیں دوسری جانب خود کو مکمل طور پر ان مشینوں پر منحصر کر کے خود کو تقریباً مجبور و مفلوج کر لیا ہے۔ ہم روز مرہ کی زندگی کے تقریباً تمام کام مشینوں کے ذریعہ آسانی سے کر سکتے ہیں۔ مثلاً عمارتوں کی تعمیر، کاشت کاری، زراعت کا کام، گھر کے مختلف کام، مختلف قسم کی گاڑیوں کی ایجاد کرنا، سفر کرنا وغیرہ۔ مشینوں کے ذریعہ مہینوں کا کام دنوں میں اور دنوں کا کام گھنٹوں میں ہو جاتا ہے۔ قدیم زمانے میں جہاں ایک کام کو متعدد لوگ مل کر کیا کرتے تھے آج اس کام کو ایک مشین کم وقت میں آسانی کے ساتھ انجام دیتی ہے۔ اس وجہ سے انسانی زندگی میں مشینوں کی اہمیت میں اضافہ ہو رہا ہے۔

انسان کی زندگی کبھی بھی مستحکم نہیں رہتی بلکہ یہ اس کے معاشی، سیاسی، سماجی، تہذیبی و ثقافتی حالات و معاملات اور مختلف مسائل کے سبب تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ سماج انسان کے باہمی رشتوں سے وجود میں آتا ہے، جہاں لوگ اپنی ضروریات کی تکمیل کی غرض سے ایک دوسرے سے جڑے ہوتے ہیں۔ اسی طرح ثقافت کا دائرہ بھی بہت وسیع ہے۔ یہ کسی ملک یا علاقے کے انسانوں کے شخصی اوصاف، روایات، زبان و ادب، علوم و فنون، مذہب اور دیگر معاشرتی اصولوں و پیمانوں پر محیط ہے۔ جب انسان کی ضروریات، اس کے ماحول و فضا میں تبدیلی رونما ہوتی ہے تو اس کے نتیجہ میں سماجی و ثقافتی اصول و پیمانے بھی متاثر ہوتے ہیں لہٰذا انسانی زندگی کی مانند سماج و ثقافت بھی تغیر پذیر ہے۔

بیسویں صدی کے آخر اور اکیسویں صدی کے ابتدائی دور میں انسان نے سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں اس قدر برق رفتاری سے ترقی کی منزلیں طے کی ہیں کہ اس نے مثبت اور منفی دونوں اعتبار سے زندگی، سماج، تہذیب و ثقافت کو متاثر کیا ہے۔ سائنس کی ترقیات و انکشافات کے اسباب کمپیوٹر، انٹرنیٹ، موبائل فون کی آمد، مختلف کاموں کے لیے مختلف مشینوں کی ایجاد وغیرہ ہیں۔ پھر یوں ہوا کہ ہماری روز مرہ کی زندگی میں ان مشینوں کا عمل دخل شروع ہوا۔ دور حاضر میں یہ عالم ہے کہ انسان اپنی روز مرہ کی زندگی میں تقریباً ہر کام کے لیے مشینوں پر منحصر ہے۔ ایک طرف جہاں انسان نے ان مشینوں کے ذریعہ اپنی زندگی میں آسانی پیدا کی ہے وہیں دوسری جانب خود کو مکمل طور پر ان مشینوں پر منحصر کر کے خود کو تقریباً مجبور و مفلوج کر لیا ہے۔ ہم روز مرہ کی زندگی کے تقریباً تمام کام مشینوں کے ذریعہ آسانی سے کر سکتے ہیں۔ مثلاً عمارتوں کی تعمیر، کاشت کاری، زراعت کا کام، گھر کے مختلف کام، مختلف قسم کی گاڑیوں کی ایجاد کرنا، سفر کرنا

وغیرہ۔مشینوں کے ذریعہ مہینوں کا کام دنوں میں اور دنوں کا کام گھنٹوں میں ہو جاتا ہے۔قدیم زمانے میں جہاں ایک کام کو متعدد لوگ مل کر کیا کرتے تھے آج اس کام کو ایک مشین کم وقت میں آسانی کے ساتھ انجام دیتی ہے۔اس وجہ سے انسانی زندگی میں مشینوں کی اہمیت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ٹیکنالوجی کی ترقی کے سبب آج انٹرنیٹ وموبائل کے ذریعہ نہ صرف ملک ، بلکہ دنیا کے کسی بھی گوشے میں موجود اپنے رشتہ داروں ، دوست ، احباب وغیرہ سے گفتگو کر کے ان کے حالات دریافت کر سکتے ہیں۔لیکن یہ تمام آلات بجلی یا ایندھن کے ذریعہ استعمال میں لائے جاتے ہیں۔اگر کسی وجہ سے بجلی یا ایندھن میسر نہیں ہو پاتا تو اس سے ہماری زندگی پر منفی اثرات رونما ہوتے ہیں۔ ہمارے گھروں میں، دفتروں میں، اسکول کالج وغیرہ میں روزمرہ کے تقریباً تمام کام متاثر ہوتے ہیں۔لہٰذا بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ماضی میں انسان جہاں آزاد پرندے کی مانند تھا اپنے تمام کام خود کرتا تھا وہیں آج مشین نما پنجرے میں قید ہو کر زندگی بسر کر رہا ہے۔ آج کا دور سائنس اور ٹکنالوجی کا دور ہے انسانی ذہن خدا کی سب سے بڑی نعمت ہے۔اسی نعمت کے باعث اس نے چاند تک رسائی حاصل کی۔زمین وآسمان،سمندر وغیرہ پر قابض ہو چکا ہے غرض کہ انسانی زندگی کے ہر شعبے میں مشینیں داخل ہو چکی ہیں۔سائنسی انکشافات وترقیات اور Globalization کے عمل دخل کے سبب اس قدر تیز رفتاری سے تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں کہ انسانی اقدار وافکار،تصورات وخیالات، ماحول وفضا۔یہاں تک کہ انسانی رشتوں کی تعریفیں بھی تبدیل ہو رہی ہیں۔ان وجوہ کے سبب ایک انسان دوسرے انسان کو شکوک وشبہات کی نظر سے دیکھنے لگا ہے۔

چونکہ انسان سماج کا ایک فرد ہے اور ادب کو سماج کا آئینہ تصور کیا جاتا ہے۔سماجی، سیاسی،تہذیبی وثقافتی سطح پر تبدیل شدہ صورت حال کے نقوش ادب کے آئینہ میں پیش کئے جاتے ہیں۔ سماج میں پیش آنے والے حالات وواقعات کی ترجمانی شاعر وادیب اپنی مخصوص شعری ونثری اصناف کے ذریعہ کرتے ہیں جس سے ان کی شاعری ونثر میں تبدیلی رونما ہوتی ہے۔لہذا سماجی وثقافتی منظر نامے کا اثر اردو شاعری پر بھی رونما ہوا۔ غزل اردو شاعری کی سب سے زیادہ لچکدار اور تغیر پذیر صنف سخن ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس نے ہر دور میں سماج اور تہذیب و ثقافت کے تقاضوں کے مطابق خود کو تبدیل کیا ہے۔اس نے سماج، سیاست،تہذیب وثقافت کی ہر خوبی وخامی کی جانب لوگوں کی توجہ مرکوز کی اور سماج وثقافت کی ہر تبدیلی کو قبول کیا۔

اس طرح واضح ہوتا ہے کہ غزل نے عہد بہ عہد رونما ہونے والی تبدیلیوں کو اپنے روایتی طرز اظہار میں ادا کیا۔غزل نے اپنی روایات کی حدود میں رہتے ہوئے ہر دور میں تبدیلیوں اور نئے رجحانات کو قبول کیا،جس کے سبب غزل پہلے سے زیادہ جاندار، تابناک اور توانا ہو کر ابھرتی گئی ۔ غزل اردو شاعری کی مقبول ترین صنف سخن ہے۔ ہر دور میں تقریباً تمام شعرا نے اپنے عہد کے تغیرات اور مختلف مسائل کو غزل کے پیرائے میں بیان کیا۔

اس طرح ظاہر ہوتا ہے کہ قدیم زمانے سے شعرا نے غزل کے بنیادی موضوعات کو مختلف انداز سے برتا ہے۔صنف غزل نے ہر دور میں اپنی انفرادیت واہمیت کو برقرار رکھتے ہوئے اپنے انداز واطوار کو تبدیل کیا ہے،جس وجہ سے دور حاضر کی غزل روایتی غزل سے مزاج ومنہاج،انداز واسلوب،موضوعات ومضامین،رنگ وآہنگ ہر اعتبار سے مختلف ومنفرد نظر آتی ہے۔

پھر عہد غالب تک آتے آتے غزل منتہائے کمال کو پہنچتی ہے ،غالب نے اپنی زندگی،اپنے زمانے کے حالات وواقعات کو غزل کے مخصوص پیرائے اظہار میں پیش کر کے غزل کے دامن کو وسیع کیا۔دور حاضر کی غزل میں تجربے اور اظہار وبیان کی جس تکرار سے دو چار نظر آتی ہے اس کا نقطۂ آغاز غالب کے یہ اشعار ہیں۔

سنبھلنے دے اے نا امیدی کیا قیامت ہے
کہ دامن خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

غالب

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

غالب

غالب نے اپنے عہد کے تقریباً تمام موضوعات کو اپنی شاعری میں یکجا کر لیا تھا اور آخر میں غزل کے دامن کے تنگ ہونے کی شکایت کرتے ہیں کہ اب غزل کے دامن میں مزید بیان کرنے کی گنجائش باقی نہیں ہے۔عہد غالب کے بعد غزل زوال پزیر ہونے لگی۔پھر بیسویں صدی میں حسرت، فانی، اصغر، جگر اور شاد وغیرہ نے غزل کو نئی تازگی وتوانائی بخشی۔اس طرح عہد بہ عہد غزل کے موضوعات میں بھی تبدیلی رونما ہونے لگی۔بیسویں صدی میں اقبال ایک اہم شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں کیونکہ انھوں نے اردو شاعری کو فکر وفن کے اعتبار سے نئی تازگی وتوانائی عطا کی۔اس طرح عہد بہ عہد زمانہ کے ساتھ ماحول وفضا،حالات و واقعات،سماج،تہذیب وثقافت تبدیل ہوتے گئے جس کا اثر اردو غزل نے بخوبی قبول کیا،جس کے سبب غزل کا انداز بیان،لب ولہجہ،نغمگی و

موسیقی وغیرہ تبدیل ہوتے گئے۔

شاعری ہو یا نثر موضوعات کا تعلق شاعر وادیب کی فکر پر منحصر ہے اوراس کے فکری رجحان اس کی زندگی ،سماجی ،تہذیبی و ثقافتی سطح پر رونما ہونے والے مختلف مسائل کے سبب تبدیل ہوتی ہے اور جب فکر تبدیل ہوتی ہے تو موضوعات میں تبدیلی رونما ہوتی ہے۔

اس طرح غزل محض محبت، حسن وعشق کے مختلف موضوعات تک محدود نہیں رہی بلکہ شعرا نے اس کے روایتی اسلوب وموضوعات میں تبدیلی پیدا کی مثلاً محبت، حسن وعشق کے دائرے سے باہر نکل کر غم ومسرت، آس و یاس، اداسی وشادمانی، گمشدگی وموجودگی، زوال وکمال، وغیرہ متعدد موضوعات کا بیان غزل کے اشعار کے پردے میں اس کے روایتی رموز و علائم کی تہ داری کے ساتھ کیا جانے لگا۔

دورحاضر کی غزل کا نیا پن موضوع سے کہیں زیادہ موضوع کی پیش کرنے کے طریقہ یعنی طرز ادا سے ہے۔ روایتی موضوع طرزِ اظہار نیز اسلوب بیان سے مختلف ہونے کی بدولت آج کی غزل قدیم زمانے کی غزل سے متعلق مختلف ومنفرد نظر آتی ہے۔آج کی غزل میں زبان و بیان اورطرز اظہار کے نئے اوراچھوتے انداز کا استعمال کرنے اوراس کوفروغ دینے کے ساتھ نئے نئے الفاظ کی تخلیق کرنے اوران الفاظ کواپنی شاعری میں استعمال کرنے کا رجحان ہمیشہ ہی سے رہا ہے۔اس وجہ سے غزل کو ایک ایسی زبان ملی جس میں روایتی غزل کے مقابلے میں خوشگوار تازگی و توانائی کا احساس ہوتا ہے۔

اسی طرح مشینی عہد حاضر میں مشینوں کی حکمرانی،سوشل میڈیا کی آمد وغیرہ کے نتیجہ میں انسانی زندگی نیز سماج وثقافت کے میدان میں رونما ہونے والے تغیرات کے واضح نقوش واثرات اردوشاعری بالخصوص غزل پر بھی مرتسم ہوئے مثلاً مغربی تہذیب وثقافت کے اثرات نے اس قدر برق رفتاری سے ہندوستانی سماج وثقافت کو متاثر اور تبدیل کر دیا ہے کہ لوگ اپنی روایتی تہذیب وثقافت سے دور ہوتے جارہے ہیں۔

ہر ایک گھر میں ہے چرچا فرنگی فیشن کا
ہم اپنے پرکھوں کی میٹھی زبان بھول گئے

فردوس گیاوی

پڑی ہے بے کفن تہذیب کی اک لاش راستے پر
نہ جاتا پاس کوئی ہے نہ ہاتھ اس کو لگاتا ہے

آزاد سونی پتی

درجہ بالا اشعار سے واضح ہوتا ہے کہ مغربی تہذیب وثقافت کے اثرات ہندوستانی تہذیب وثقافت پر رونما ہورہے ہیں۔مغربی تہذیب و ثقافت کے اثرات انسانی شخصیت، زبان وادب،علوم وفنون وغیرہ پر بھی رونما ہورہے ہیں۔اس کے علاوہ مغربی تعلیم نے ہندوستان کے لوگوں کے ذہنوں کووسعت اورروشنی سے ہمکنار کیا، جس کے سبب ہندوستانی سماج نیز شاعروں کے فکری وفنی سطح پر بھی تبدیلی رونما ہونے لگی

اردوشاعری میں آئینہ کا تصور یہ ہے کہ آئینہ سامنے والے شخص کا عکس دیکھ کر حیران ہوتا ہے لیکن آج صورت حال یہ ہے آئینہ اپنی جگہ ساکت ہے لوگ اپنے حالات ومعاملات اوراپنی زندگی کے مختلف مسائل وغیرہ کو دیکھ کر حیران ہیں۔

ہنستے ہوئے حروف میں جس کو ادا کروں
بچوں سے کس جہاں کی کہانی کہا کروں

شہپر رسول

کہانیاں سننا بچوں کا دلچسپ مشغلہ ہوتا ہے۔ بچوں کا ذہن کورے کاغذ کی مانند ہے کہ اس پر جو لکھ دیا جائے وہ ہمیشہ کے لیے نقش ہوجاتا ہے۔لہذا بچوں کوایسی کہانیاں سنائی جاتی ہیں جوان کے قوت تخیل پر منفی اثرات مرتسم نہ کرے۔ لیکن عہد حاضر کا انسان اپنے دور کے حالات اور مختلف مسائل کی وجہ سے اس قدر پریشان ہے کہ اس کے حافظے میں ایسی کہانی جو بچوں کو سنائی جاسکیں۔

غزل کا بنیادی موضوع محبت، حسن وعشق کے جذبات واحساسات کا بیان کرنا ہے ساتھ ہی غزل میں اشاروں اور کنایوں میں گفتگو کی جاتی ہے۔ چونکہ شاعر اپنے عہد کے حالات وواقعات سے متاثر ہو کر شعر کہتا ہے لہذا دورحاضر میں سماجی، سیاسی، معاشی،تہذیبی وثقافتی سطح پر مختلف دباؤ اور مسائل سے پیدا ہونے والے منتشر فکر وخیال کے سبب شاعر کی قوت تخیل محبت اورحسن وعشق کے موضوعات کی جانب توجہ مرکوز نہیں کرتی۔ لہٰذا انھیں تغیرات کا بیان وہ اپنی شاعری میں مکالمہ کے طور پر کرتا ہے۔ جب کہ شاعری میں اشاروں وکنایوں میں بات کی جاتی ہے لہٰذا شاعر خدا کے حضور میں دست بہ دعا ہے۔

ڈر ہے طلسم ہوش رُبا ماند پڑ نہ جائے
پرکھوں کی کیسی کیسی کہانی گھڑی گئی

ڈاکٹر رؤف خیر

داستان افسانوی ادب کی قدیم صنف ہے۔داستان طلسم ہوش ربا اور دیگر داستانوں کے تجسس اور تحیر کا جوش ماند پڑ رہا ہے۔ چونکہ داستانوں کی بنیادی خصوصیت مافوق الفطری عناصر مثلاً جن، پری، بھوت راکشس،

دیو، دیونی وغیرہ کا بیان داستانوں میں ہوا کرتا تھا لوگ ان پر یقین کیا کرتے تھے اور دلچسپی کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ دور حاضر میں سائنس کی ترقیات کے سبب انسانی ذہن ان مافوق الفطری عناصر کو تسلیم کرنے سے قاصر ہے اور اب لوگوں کے پاس اتنا وقت بھی نہیں ہے کہ طویل داستان کو بیٹھ کر پڑھیں یا سنیں لہٰذا داستان گوئی اب ماضی کا قصہ بن چکا ہے۔

قدموں میں کس کے ڈال دوں یہ نام یہ نسب
کچھ تو بتاؤ کس کا قصیدہ پڑھا کروں

شہپر رسول

صنف قصیدہ درباروں سے وابستہ ہوا کرتی تھی۔ شعرا بادشاہوں، نوابین وسلاطین کی شان میں قصیدہ کہا کرتے تھے اور انعام واکرام حاصل کیا کرتے تھے لیکن آج صورت حال یہ ہے کہ نہ دربار باقی ہے نہ بادشاہوں، نوابین وسلاطین کی محفلیں، جن سے کچھ انعام واکرام میسر ہو سکے۔ عہد حاضر میں جو قیامت صغری برپا ہے اس کے عذاب میں گھرے ہوئے انسان کے نام ونسب خاندان اور نسل کے معنی تقریباً گم ہو چکے ہیں۔ وہ شناختیں جو ماضی میں وجہ افتخار تھیں آج بے معنی ہو کر رہ گئی ہیں۔ لہٰذا شاعر استفہامیہ انداز میں پوچھ رہا کہ کسی کی تعریف میں قصیدہ کہوں۔

چراغ کی لو بجھنے سے قبل تیز ہو کر پھڑ پھڑاتی ہے، اسی طرح انسان کی زندگی کو چراغ کی لو سے تشبیہ دی گئی ہے۔ موت ایک فطری عمل ہے جب انسان کی دھڑکن خرابی کی وجہ سے رک جاتی ہے، تو اس کے زندگی ختم ہو جاتی ہے لیکن میڈیکل سائنس کے شعبہ میں انقلابی ایجادات میں سرجری کے جو نئے پیمانے وضع کیے ہیں، اس کے نتیجے میں بیمار انسان کو ایک امید ہوتی ہے کہ اگر اس کو بہتر علاج مہیا ہو گیا تو شفا حاصل ہو سکتی ہے۔

بے مقصد کے شغل بھی راس آ جاتے ہیں
وقت کبھی برباد بھی کرنا پڑتا ہے

معین شاداب

انسان اپنی زندگی کے مختلف مسائل اور روزمرہ کے مختلف کاموں کی وجہ سے جب تھک جاتا ہے، تو مزاج کی تبدیلی کی خاطر ایسے مشاغل اختیار کرتا ہے جس میں اس کی دلچسپی ہوتی ہے لیکن اپنی ذمہ داریوں اور وقت کی کمی کے باعث نہیں کر پاتا ہے۔

اب یہ دھن چھوڑ بھی دو اس کو کہاں پاؤ گے
گھر چلو ورنہ کہیں اور نکل جاؤ گے

احمد محفوظ

انسان اپنی خواہشات کی تکمیل کی غرض کے لیے سرگرداں رہتا ہے۔ لیکن جب مسلسل تلاش وجستجو کے باعث اس کو کامیابی حاصل نہیں ہوتی اور نہ ہی ان کے مکمل ہونے کے امکانات نظر آتے ہیں تو اس صورت میں شاعر کہتا ہے کہ اپنی خواہشات کے پورا ہونے کی امید چھوڑ دو اور اپنے گھر کی جانب روانہ ہو کیونکہ اس دنیا میں جہاں نیک راہ پر چلانے والے لوگ موجود ہیں وہیں گمراہ کرنے والوں کی بھی کمی نہیں ہے۔

ہم ذکر گل وبلبل کرتے ہوئے ڈرتے ہیں
اب سیکھ گیا ہے وہ ہر بات کا پا جانا

وارث کرمانی

غزل ایک لچکدار صنف سخن ہے۔ اس نے ہر دور میں زمانے کے تقاضوں کے مطابق خود کو تبدیل کیا ہے جس کے سبب اس کے موضوعات میں تبدیلی پیدا ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ دور حاضر کا شاعر قدیم تشبیہات و استعارات مثلاً گل وبلبل، تیشہ وسنگ، ضرب کلیم، فرہاد وکوہ وغیرہ کا استمال اپنی شاعری میں نہیں کرتا ہے۔ شاعر کہتا ہے محبوب اب اشاروں کنایوں کی باتوں کو سمجھنا سیکھ گیا ہے لہٰذا دور حاضر میں ان استعارات وتشبیہات کا استعمال کرنا نا گریز ہے۔

چاروں طرف سے شہر مگر پھیلتا گیا
کہتے بھی ہم تو کس سے کہ گوشہ نشیں ہیں ہم

من موہن تلخ

لوگ گاؤں سے شہروں کی جانب منتقل ہونے لگے جس وجہ سے شہری آبادی بڑے روزگار کے میدان میں اضافہ ہوا۔ صورت حال یہ ہے کہ لوگ شہروں میں مصروفیت کی زندگی بسر کر رہے ہیں ایسی صورت میں شاعر کہتا ہے کہ کسی کے پاس کسی کے لیے وقت نہیں ہے۔ جب ہمارے پاس کوئی اپنا ہے ہی نہیں تو ہم کس سے کہیں کہ ہم نے گوشہ نشینی اختیار کرتی ہے۔

وہ عجیب شکر گزار ہے چلو اس کے ہونٹ ہی چوم لیں
کہ تمام ہجر کے درمیاں وہی ذکر روزِ وصال کا

ابوالحسناف حقی

شاعر عشق کی اس منزل پر پہنچ گیا ہے کہ اس کو محبوب سے وصال تو میسر ہوا لیکن محبوب سے ملاقات کی مدت بہت مختصر تھی۔ یا یوں کہیے کہ صرف دیدار ہی نصیب ہوا۔ لیکن عاشق اپنی قسمت پر شاکر رہا اور اس کو اس بات کا صبر تھا کہ ہجر کی تمام مدت کے درمیان وہی ایک ملاقات کا لمحہ تھا جس نے اس کو اپنے محبوب کے احساس سے محروم نہیں ہونے دیا۔

آج بجلی نہیں ہے تو آ جا
پھر اندھیری یہ رات ہو کہ نہ ہو

بڑے شہروں جیسے دلّی، بمبئی، بنگلور وغیرہ میں جہاں کی کشاکش بھری زندگی سوتی نہیں ہے، ایسے شہروں میں رات بھی دن کی مانند ہوتی ہے۔ لوگوں کو مصروفیت اور افراتفری بھری زندگی کے باعث ایسے مواقع نہیں مل پاتے کہ وہ اپنے محبوب کے ساتھ تنہائی میں وقت گزار سکیں۔ اس کے برعکس جہاں قدیم زمانے میں مناسب وقت کے ساتھ موقع ومحل، مقام وجگہ کی کمی نہیں تھی۔ وہیں دور حاضر کا شاعر اپنے محبوب کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ مدتوں بعد آج ہمیں یہ موقع قسمت سے میسر ہوا ہے۔ چونکہ آج اتفاقاً بجلی چلی گئی ہے اور چاروں طرف اندھیرہ ہے، یہ ملاقات کے لیے مناسب وقت ہے لہٰذا ایسے میں تو آج ہم سے ملاقات کو آجا پھر پتہ نہیں کب یہ موقع ہمیں میسر ہو۔

تو ہے ہر جائی تو اپنا بھی یہی طور سہی
تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی

قلق میرٹھی

قدیم زمانے میں عشق کا تصور یہ تھا کہ وہ جذباتی، روحانی ہوا کرتا تھا۔ قدیم زمانے میں جہاں عاشق محبوب کا وفادار ہوا کرتا تھا اور محبوب کے بے پناہ ظلم وستم سہنے کے باوجود وہ اپنی وفاداری پر قائم رہتا تھا اور صبر سے کام لیتا تھا۔ لیکن دور حاضر کا شاعر کہتا ہے کہ جب محبوب کے اندر ہر جائی پن ہے اس کے اندر وفاداری نہیں تو ہم بھی اب یہی طور اختیار کرتے ہیں، اگر تم ہمارے لیے وفادار نہیں ہو تو ہم بھی تمہارے لیے وفادار نہیں۔

وہ بھی پاس آتا ہے جب اس کو غرض ہوتی ہے
ہم بھی اس شوخ سے ملتے ہیں مہاجن کی طرح

موجودہ معاشرے میں مادیت داخل ہو چکی ہے، مادیت پرستی کے بڑھتے ہوئے رجحانات کے سبب تہذیبی وثقافتی سطح پر بھی عدم توازن نظر آنے لگا ہے۔ جس کے اثرات اردو شاعری پر بھی مرتسم ہوئے۔ روایتی شاعری میں جہاں عاشق اپنے معشوق کا وفادار ہوا کرتا تھا وہیں اس کے برعکس دور حاضر میں عاشق ومعشوق دونوں مفاد پرست ہیں، دونوں میں خلوص باقی نہیں رہا ہے۔ معشوق موقع پرست ہے، جب اس کو کوئی کام ہوتا ہے تب وہ عاشق کے پاس آتا ہے ایسی صورت میں شاعر کہتا ہے کہ اگر یوں ہی ہم نے اس کا کام کر دیا تو پھر وہ دوبارہ نہیں آئے گا یا پھر تب ائے گا جب اس کو کوئی اور کام ہوگا لہذا جب وہ آتا ہے تو ہم اس کے کام کی اس سے پوری قیمت ادا کرواتے ہیں۔

شکم کی آگ لیے پھر رہی ہے شہر بہ شہر
سگ زمانہ ہیں ہم کیا ہماری ہجرت کیا

افتخار عارف

دور حاضر کا ایک اہم مسئلہ 'بھوک' ہے۔ روزگار کی تلاش میں لوگ ایک شہر سے دوسرے شہر میں منتقل ہوتے رہتے ہیں آبادی زیادہ ہے اور روزگار کے وسائل مختصر ہیں۔ جس وجہ سے لوگوں کو اپنی تمام عمر اپنے گھر سے دور ایسی جگہ گزارنی پڑتی ہے۔ جہاں انہیں روزگار کے وسائل مہیا ہو سکیں۔

مجھ کو خود مجھ سے بھی ملنے نہیں دیتی دنیا
چھپ کے ملتا ہوں کبھی جب نہیں ہوتا کوئی

سلیمان اریب

اردو شاعری کا ایک اہم اور بنیادی موضوع تنہائی ہے۔ لیکن دور حاضر کی کشاکش بھری زندگی میں لوگوں کے پاس خود کے لیے وقت نہیں ہے۔ شاعر نے دور حاضر کی اسی تبدیلی کی جانب اشارہ کیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ آج حالات یہ ہیں کہ دنیا کی بھیڑ بھاڑ میں اپنی مصروفیت بھری زندگی میں سکون کے دو لمحات نصیب ہونا بہت مشکل ہے۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے جب کوئی پاس نہیں ہوتا تب ہم اپنے آپ سے گفتگو کر کے اپنی گزری ہوئی زندگی کے متعلق سوچتے ہیں۔

شاعری میں سماجی وثقافتی حالات وواقعات کی ترجمانی کے نمونوں کی فہرست اس قدر طویل ہے کہ اگر ان تمام موضوعات کو یکجا کیا جائے تو کئی ضخیم کتابیں وجود میں آسکتی ہے۔ یہاں صرف ان موضوعات کی جانب اشارہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ دور حاضر کی شاعری جس قسم کی فضا کا احساس دلاتی ہے اور جس قسم کے تخلیقی تجربوں کی شہادت دیتی ہے، وہ غزل کی روایتی فضا وتصور سے مختلف ہے۔ ہر دور میں شعرا نے زمانے کے تقاضوں کے مطابق غزل کی روایتی فضا وتصور میں تبدیلی پیدا کی ہے۔ بعض شعرا کے یہاں یہ تبدیلی واضح طور پر ظاہر ہوتی ہے۔ بعض کے یہاں شعری پیراہن میں پوشیدہ رہتی ہے۔ غرض کہ مشینی دور میں انسانی زندگی نیز سماج وثقافت اور فکر ونظر میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کے اثرات مختلف شعری اصناف بشمول اردو غزل پر دیکھے جا سکتے ہیں۔

❑❑❑

Sana
Research Scholar
Deptt Of Urdu MJP.
Rohilkhand University
Bareilly-243006 (U.P)
sanabcb3@gmail.com
Mob: 7248766980

تعلیم کو بذات خود ایک مقصد بھی سمجھا گیا ہے اور دوسرے مقاصد کے حصول کا ایک ذریعہ بھی۔ یہ افراد کی شخصیت کو نشو و نما دیتی ہے۔ انھیں بعض اقتصادی، سیاسی اور ثقافتی کاموں کو انجام دینے کا اہل بناتی ہے اور اس طرح ان کی سماجی اقتصادی حیثیت کو بہتر بناتی ہے۔ اس کو ایک ایسا بڑا آلہ کار تسلیم کیا گیا ہے جس کو انسانی معاشرے تغیر اور ترقی کے عمل کو مطلوبہ مقصدوں اور منزلوں کی سمت لے جانے کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔ یہ عمودی نقل و حرکت کی صلاحیت بہم پہنچاتی ہے اور اس طرح مختلف سماجی سطحوں سے تعلق رکھنے والے افراد کے درمیان مساوی درجہ قائم کرنے میں مدد دے ہے۔ ''انسانی حقوق کا عالمی اعلان''
(THE UNIVERSAL DECLARATION OF HUMAN RIGHTS)
اس کو ہر ایک فرد انسانی کے بنیادی حقوق میں سے ایک حق قرار دیتا ہے۔

عورتوں کی حیثیت کو بہتر بنانے کے لیے جو تحریک پوری دنیا میں چل رہی ہے اس نے سماج میں عورتوں کی محکومانہ حیثیت کو بدلنے کے لیے اہم ترین آلہ کار کی حیثیت سے تعلیم پر ہمیشہ ہی زور دیا ہے۔ انیسویں صدی کے ہندوستانی سماجی صالحین نے بھی اس نقطۂ نظر کو مانا تھا۔ تاہم ان کا مطمح نظر عورتوں کو بیویوں اور ماؤں کی حیثیت سے اپنے روایتی کردار ادا کرنے کے زیادہ قابل بنانے کے لیے تعلیم کو استعمال کرنا تھا نہ کہ سماجی اقتصادی یا سیاسی ترقی کے عمل میں ان کو اور زیادہ اہل اور سرگرم اکائیاں بنانا۔ نو آبادیاتی اہل اقتدار نے عورتوں کی تعلیم کے اسی محدود نقطۂ نظر کی حمایت کی۔ لیکن بیسویں صدی میں تعلیم اور صحت کے ملکوں کی توسیع نے تیزی کے ساتھ لیڈی ڈاکٹروں اور استانیوں کی ضرورت پیدا کر دی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ دو غیر سرکاری پیشے عورتوں کی تعلیم کے لیے بنائے گئے پروگراموں میں شامل کر لیے گئے۔

آزادی کے حصول اور مساوات کی دستوری ضمانتوں نے نئے ابعاد پیدا کر دیے جن کے ساتھ عورتوں سے حالات کا مطالبہ پیدا ہوا کہ وہ نظام سیاست، معیشت اور سماج میں گوناگوں کردار ادا کریں۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد والے برسوں میں بین الاقوامی ایجنسیوں نے بھی ایک ایسے آلہ کار کی حیثیت سے تعلیم کے رول پر زور دیا جو عورتوں کو نئے سماجی نظام کی تعمیر کرنے کے لیے ضروری خصوصیات سے آراستہ کر سکتا ہے۔ لیکن تعلیم پر اس نئے زور کے باوجود ہندوستان میں عورتوں کی تعلیم کے متعلق جو رویے اختیار کیے گئے انھوں نے بہ یک وقت دو طرفہ رجحان کا اظہار کیا ہے جس میں ایک طرف روایتی محدود زاویہ نظر تھا اور دوسری طرف وسیع نیا تصور اور یہی دو طرفہ رجحان ہے جس نے مردوں اور عورتوں دونوں کے لیے تعلیمی منصوبہ بندی وسائل کے تعین اور سماج میں اقدار کے ارتقا کو متاثر کیا ہے۔

تعلیم نسواں کی ترقی، مقداری پہلو

ہم نے عورتوں کی تعلیمی ترقی کا جائزہ دوطرح سے لیا ہے۔یعنی (1) مقداری علامات کے ذریعے جیسے اداروں میں طالبات کی مندرجہ تعداد فارغ التحصیل طالبات کی تعداد تعلیمی سہولتیں۔خواندگی کی شرحیں اور تعلیم یافتہ عورتوں کی کل تعداد اور (2) اس مبینہ قومی مقصد کی روشنی میں کہ عورتوں کو مردوں کے ہم رتبہ افراد کی حیثیت سے قومی ترقی کے تمام پہلوؤں میں ضم کیا جائے۔

(1) طالبات کی مندرجہ تعداد (ENROLMENT) - دستور کی اس ہدایت پر کہ سب بچوں کو چودہ سال کی عمر تک لازمی مفت تعلیم دی جائے۔اب تک عمل نہیں ہو سکا۔ماہرین تعلیم اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ اس ناکامی کا خاص سبب لڑکیوں میں تعلیمی ترقی کی سست رفتار ہے۔مندرجہ فہرست ذاتیں اور مندرجہ فہرست قبائل۔چوتھے منصوبے کی مدت کے خاتمے پر 6 تا 11 سال کی عمر کے گروپ میں صرف 66 فی صد لڑکیاں اسکولوں میں پڑھ رہی تھیں 11 تا 14 سال کے گروپ میں یہ تعداد صرف 22 فی صد تھی۔ان ہی دو گروپوں میں لڑکوں کی تعداد بالترتیب 10 فی صد اور 48 فی صد تھی۔

لیکن جب آزادی سے قبل کے دور میں ہونے والی عورتوں کی تعلیمی ترقی کے ساتھ مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ آزادی کے بعد کے دور میں تعلیم نسواں کی ترقی حیرتناک طور پر غیر معمولی ہوئی ہے۔عورتوں کی تعلیم کی توسیع جو ابتدائی دور میں ہوئی زیادہ تر اسی منزل تک محدود رہی۔1947 میں پرائمری اسکولوں میں مندرجہ تعداد (3475165) تعلیمی نظام میں درج شدہ تمام لڑکیوں کی تعداد کا 83 فیصد تھی۔مڈل اسکولوں میں صرف 321000 لڑکیوں کے نام درج تھے جو کہ کل پڑھنے والی لڑکیوں کی 9 فیصد تھیں۔ثانوی اسکولوں میں پڑھنے والی لڑکیاں 281000 تھیں۔جو کل پڑھنے والی لڑکیوں کی 7 فیصد تھیں اور اس کے باوجود بھی ہندوستانی یونیورسٹیوں نے مغربی یونیورسیٹوں کے مقابلے میں لڑکیوں کو داخلہ دینے میں خود کو زیادہ کشادہ دل ثابت کیا تھا۔اعلی تر تعلیم کے کورسوں میں ان کے یہاں طالبات کی تعداد (23000) صرف کل پڑھنے والی لڑکیوں کے ایک فیصد کے نصف سے کم تھی۔1947 میں مختلف سطحوں پر 100 لڑکوں کے مقابلے میں لڑکیوں کی تعداد پرائمری سطح پر 36 مڈل سطح پر 22 ثانوی سطح پر 14 اور یونیورسٹی سطح پر 19 تھی۔

1973-74 تک مختلف مرحلوں پر اداروں میں درج شدہ لڑکیوں کی تعداد میں نیز لڑکوں کے ساتھ ان کے تناسب میں زبردست اضافہ ہو چکا تھا۔پرائمری سطح پر اسکولوں میں درج شدہ لڑکیوں کی تعداد 2 کروڑ 44 لاکھ۔زیادہ تھی۔(100 لڑکوں کے مقابلے میں ان کا تناسب (62) مڈل سطح پر 45 لاکھ سے زیادہ (تناسب 43) ثانوی سطح پر 23 لاکھ سے زیادہ (تناسب 36) اور کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تقریباً 9 لاکھ (تناسب (3)۔اس مدت کے دوران تعلیمی نظام کے مختلف مرحلوں کے درمیان تمام درج شدہ لڑکیوں کی تقسیم میں بھی تبدیلی ہوئی ہے۔1970-71 تک 73 فی صد پرائمری اسکولوں میں 14 فیصد مڈل اسکولوں میں 7٫3 فیصد ثانوی اسکولوں میں 4٫2 فیصد کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اور 3٫3 فی صد پیشہ ورانہ اسکولوں میں ہوگئی تھیں۔

اس بے مثال ترقی کے باوجود مجموعی صورت حال میں بہت کچھ مطلوبہ چیزوں کی ضرورت باقی رہ گئی۔اس صورت حال کی بعض بڑی بڑی کمزوریاں حسب ذیل ہیں:۔

1۔ پہلے سے پانچویں جماعتوں میں تین میں سے ایک لڑکی اسکول میں داخل نہیں ہے۔پڑھائی چھوڑ دینے والی لڑکیوں کی شرح بھی بہت زیادہ ہے۔پہلی جماعت میں داخلہ لینے والی 100 لڑکیوں میں سے صرف 30 لڑکیاں پانچویں بہت تک پہنچتی ہیں۔

2۔ پانچویں سے آٹھویں تک کی جماعتوں میں پانچ میں سے صرف 1 لڑکی اسکول میں داخل ہے۔6 تا 11 سال عمر کے گروپ میں اسکول میں داخل شدہ لڑکیوں کی تعداد آبادی کا 66 فیصد ہے، جو 11 سال تا 14 سال عمر کے گروپ میں ایک دم گھٹ کر 22 فیصد رہ جاتی ہے۔اس سے پرائمری اور مڈل مرحلوں کے درمیان پڑھائی چھوڑ دینے والی لڑکیوں کی زبردست تعداد کا اظہار ہوتا ہے۔

3۔ثانوی تعلیم کے مرحلے پر 14 تا 17 سال عمر کے گروپ میں اسکول میں داخل شدہ لڑکیوں کا تناسب گر کر آبادی کا صرف 12 فی صد رہ جاتا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ 8 میں سے صرف 1 لڑکی اسکول میں داخل ہے۔ثانوی تعلیم اب تک شہری علاقوں میں اونچے اور متوسط طبقوں تک محدود ہے۔دیہی علاقوں میں صرف خوشحال گھرانے اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں خصوصاً وہ جو متوسط طبقے سے متعلق ہیں۔1965 کے ”تعلیمی جائزے“ (Educational Surveys) کے مطابق ثانوی اسکولوں میں دیہاتی بچوں کے 17 فیصد سے کم لڑکیاں تھیں۔۔یونیورسٹی میں بی۔اے سے نیچے کی سطح کے مقابلے میں لڑکیوں کا تناسب بی اے سے اوپر کی سطح پر زیادہ ہے۔پیشہ ورانہ تعلیم میں عورتوں کی ایک کافی بڑی تعداد، معلمی، ڈاکٹری اور فنون لطیفہ میں ہے لیکن کامرس، قانون، زراعت یا

انجینئر نگ میں ان کی تعداد بید کم ہے۔عورتوں کی اعلیٰ تعلیم اور بھی زیادہ شہری متوسط اوراونچے طبقات تک محدود ہے۔۔

عورتوں کی تعلیم کی نیشنل کمیٹی (59-1958) نے لڑکے اور لڑکیوں کی تعلیم کے درمیان بڑھتے ہوئے خلا پر تشویش کا اظہار کیا تھا اور اس خلا کو ممکن ترین مدت میں پھر کرنے کے لیے خاص پروگراموں اور کوششوں کی سفارش کی تھی۔ خصوصی کوششوں کے نتیجے میں اداروں میں داخل شدہ لڑکیوں کی تعداد 1960 سے زیادہ ہونے لگی۔لیکن ہمیں افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ 1966 کے بعد یہ کوششیں سست پڑ گئیں۔ اداروں میں داخل شدہ لڑکیوں کی تعداد میں پنج سالہ افزائش کی شرح پرائمری مرحلہ پر 66-1961 میں 1ء56 فی صد تھی جو 71-1966 میں 7ء20 فیصد رہ گئی۔ثانوی تعلیم کے مرحلے پر یہ انحطاط 6ء70 فیصد سے 5ء20 فیصد تک ہوا۔لیکن یونیورسٹی مرحلے پر یہ انحطاط مقابلتہً کم ہوا یعنی 4ء109 فیصد سے 4ء78 فیصد۔اسپیشل اور پیشہ ورانہ اسکولوں میں یہ انحطاط 6ء74 سے 6ء34 فیصد تھا۔یہ ایک گہری تشویش کی بات ہے۔ اگر چہ رجسٹر میں درج شدہ طلبا کی تعداد تعلیمی ترقی کی پیمائش کرنے کے لیے عموماً خاص پیمانہ سمجھی جاتی ہے تاہم اس میں تعلیم کی ضائع ہوجانے والی اور بے مصرف و بے عمل رہ جانے والی مقدار کے مسائل بعض حدود عائد کر دیتے ہیں۔اسکولی نظام کے مختلف مرحلوں پر پڑھائی چھوڑ دینے والوں کا کل ہنداوسط لڑکوں کے مقابلے میں لڑکیوں کا ہمیشہ زیادہ رہا ہے۔ ''تعلیمی کمیشن'' نے یہ معلوم کیا تھا کہ نچلی پرائمری جماعتوں میں یہ اوسط 62 فیصد تھا جبکہ لڑکوں کا یہ اوسط 56 فیصد تھا۔اونچے پرائمری مرحلے پر یہ اوسط 34 فیصد تھا جس کے مقابلے میں لڑکوں کا 24 فیصد تھا۔ایک بعد کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ پرائمری اور مڈل اسکولوں میں تعلیم کی ضائع ہوجانے والی اور بے مصرف و بے عمل رہ جانے والی مقدار کی شرح لڑکوں میں 3ء62 فیصد اور لڑکیوں میں 3ء71 فیصد تھی اور سب سے زیادہ فرق پہلی دوسری جماعتوں میں تھا۔

فارغ التحصیل طلبار- (OUT-TURN) ::::: اسکولوں اور یونیورسٹی کی تعلیم سے فارغ ہوکر نکلنے والوں کی تعداد میں سے زیادہ اہم اور معنی خیز خصوصیات یہ ہیں کہ فی ہزار لڑکوں کے مقابلے میں ان لڑکیوں کے اضافہ کی شرح زیادہ سست ہے جو ہائر سکنڈری اور میٹرک کے امتحانات پاس کرتی ہیں، اور یویورسٹی کی سطح پر خاص طور سے پہلی ڈگری کی سطح پر یہ اضافہ کی شرح کہیں زیادہ تیز اسکول کی سطح ہے۔ کے مقابلے میں اعلیٰ تعلیم یافتہ عورتوں اور مردوں کے درمیان فرق زیادہ تیزی سے کم ہورہا ہے۔ چونکہ ہندوستان میں عورتوں کی اعلیٰ تعلیم ابھی تک ایک چھوٹی سی اقلیت تک محدود ہے۔اس لیے مجموعی طور پر اس رجحان کا اثر عورتوں کی تعلیمی ترقی پر حاشیائی و معمولی نوعیت کا ہے۔ 48-1947 سے 66-1965 کی مدت کے دوران میٹرک پاس کرنے والی لڑکیوں کی تعداد فی ہزار لڑکوں کے مقابلے میں 12 سے بڑھ کر 21 ہوگئی۔پہلی ڈگری کی سطح پر یہ اضافہ 18 سے 43 ہوا ہے۔دوسری ڈوگری کی سطح پر 13 سے 37 اور ڈاکٹریٹ کی ڈگریوں میں 4 سے 19۔ پیشہ ورانہ ڈگریوں میں یہ اضافہ 51-1950 میں 9 سے 66-1965 میں 16 تھا۔

پیشوں کی تعلیم میں عورتوں کے لیے آزادی سے پہلے جو کورس کھلے ہوئے تھے وہ یہ تھے۔ ڈاکٹری۔تعلیم نرسنگ اور قانون۔ٹیکنالوجی اور انجینئرنگ میں عورتوں کا داخلہ صرف 1948 کے بعد سے ممکن ہوا۔آغاز کی اس تاخیر کے پیش نظر ان کورسوں میں عورتوں کی کامیابی بہت اہم رہی ہے اگرچہ دوسرے پیشوں کے میدان میں ان کی نمائندگی اب بھی بہت کم ہے۔اسی طرح ریسرچ میں عورتوں کا داخلہ بھی زیادہ تر آزادی کے بعد کا ارتقا ہے اور اس سطح پر ان کی ترقی کی رفتار اطمینان بخش ہے۔اس سے پہلے جو عام عقیدے تھے کہ لڑکوں کے مقابلے میں اعلیٰ تعلیم کے لیے لڑکیوں میں کم ذہانت اور فطری موزونیت ہوتی ہے خاص طور سے ایسے مضامین میں جیسے ریاضیات یا سائنس اب ان عقیدوں کو لڑکیوں کی کامیابی نے غلط ثابت کر دیا ہے جو کہ مختلف ومتعدد امتحانوں میں لڑکیوں کی کامیابی سے آگے نکل جاتی ہے۔

3 اداروں کی تعداد میں اضافہ

تعلیم نسواں کی قومی کمیٹی نے لڑکیوں کے لیے علیحدہ اداروں کے قیام کی وکالت کی تھی تا کہ ان کی تعلیم کے خلاف جو تعصب قائم ہے اس کو توڑا جاسکے۔ 61-1960 کے بعد کے دور میں لڑکیوں کے لیے علیحدہ و مخصوص اداروں کی تعداد بڑی تیزی سے بڑھی۔48-1947 میں ایسے تعلیمی اداروں کی کل تعداد کا صرف 3ء10 فیصد تھے۔68-1967 تک وہ کل تعداد کا 29 فیصد ہو گئے، اور ان کی تعداد 16951 سے 230032 ہوگئی۔

عورتوں کے درمیان تعلیم کی اشاعت کے لیے اداروں کی سہولتوں میں اضافے کا خیر مقدم کرنے کے ساتھ ساتھ ہمیں اس تیز اضافے کی بعض خراب ومضرت رساں خصوصیات کی طرف بھی توجہ دلانا ضروری ہے۔ایسے بہت سے اسکول ہیں جن میں صرف ایک استانی ہوتی ہے اور اس کی غیر حاضری کی صورت میں وہ اکثر و بیشتر بند کردیتے ہیں جس کی وجہ

سے لڑکیوں کو اسکول بھیجنے میں بہت سے والدین کو تامل ہوتا ہے۔ لڑکیوں کے بہت سے مڈل اور ثانوی اسکولوں میں ناکافی تدریسی سہولتیں اور پست معیار ہیں خاص طور سے ایسے مضامین میں جیسے ریاضیات اور سائنس اور اس کے باعث طالبات کے لیے مضامین کا انتخاب محدود ہو گیا ہے۔ عورتوں کے کالجوں کے بیحد تیز رفتار اضافے کے باعث (جن کی تعداد 54-1952 میں 81 تھی جو 72-1971 میں 435 ہو گئی) ایسے ادارے قائم ہو گئے ہیں جن میں طالبات کی تعداد بہت کم ہے (250 کالجوں میں 500 سے کم اور 55 کالجوں میں 100 سے کم) ان کی مالی حالت بھی اچھی نہیں اور تدریس کا معیار بھی بہت پست ہے۔ یہ صورت حال اس پالیسی کے باعث پیش آئی کہ اداروں کو تسلیم کرنے کے لیے جو شرائط اہلیت تھیں ان کو نرم کر کے اور یونیورسٹیوں اور حکومت کی طرف سے خصوصی مالی امداد فراہم کر کے عورتوں کے کالجوں کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ ہمارا یہ خیال ہے کہ کم معیاری یا محدود تعلیم کی اشاعت مساوی مواقع کے حصول میں مددگار نہیں ہوگی اور خود عورتوں کی تعلیم کے داعیے کو نقصان بھی پہنچا سکتی ہے۔ معیاروں کے متعلق بہت ضروری ہے اور اس کو حوصلہ افزائی اور امداد کی پالیسی کا ایک حصہ ہونا چاہیے۔

4- معلمات

یہ بات ہمیشہ ہی تسلیم کی گئی ہے کہ معلمات کی تعداد کو بڑھانا تعلیم نسواں کی ترقی کے لیے ایک لازمی شرط ہے۔ 1947 میں اسکول ٹیچرز کا صرف 14ء4 فیصد عورتیں تھیں۔ 74-1973 میں یہ تناسب بڑھ کر پرائمری اسکولوں میں 26 فیصد مڈل اسکولوں میں 37 فیصد اور ثانوی اسکولوں میں 30 فیصد ہو گیا تھا۔ یونیورسٹیوں اور کالجوں میں یہ تناسب 51-1950 میں 5ء8 فیصد تھا جو 71-1970 میں بڑھ کر 15 فیصد ہو گیا اور معلمات کی سب سے زیادہ تعداد تعلیم کے مضمون میں (9ء22 فیصد آرٹس میں (7ء19 فیصد) اور ڈاکٹری میں (2ء12 فیصد) تھی۔ وہ یونیورسٹی کے عملہ اساتذہ کا 6ء13 فیصد سائنسوں میں اور 8ء10 فیصد قانون میں تھیں اور دیگر شعبوں میں ان کی تعداد ناقابل لحاظ تھی۔ پرائمری اسکولوں کے اساتذہ میں ان کے کم تناسب کا خاص سبب مشکلات ہیں جن کا سامنا عورتوں کو دیہی علاقوں میں ملازمت کرنے میں کرنا پڑتا ہے اور جن کی وجہ ان کے خاندان کی مزاحمت، دیہات میں عدم تحفظ کا خوف اور اس قسم کی جسمانی راحتوں اور سہولتوں کا فقدان ہوتا ہے جیسے جائے رہائش سامان کی فراہمی، آمد و رفت کے لیے سواری کا انتظام اور طبی سہولتیں۔ ہمارے خیال میں مندرجہ بالا دشواریوں کو اولیت کی بنیاد پر دور کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ تاکہ شہری اور دیہی علاقوں کے درمیان تعلیم نسواں کی ترقی میں جو موجودہ عدم توازن ہے اس کو کم کیا جا سکے اور تربیت یافتہ با استعداد استانیوں میں بڑھتی ہوئی بے روزگاری کو روکا جا سکے۔ ہمیں یہ بھی اطلاع دی گئی کہ خواتین انسپکٹروں کی ناکافی تعداد معلمات کے لیے بعض دشواریاں پیدا کر دیتی ہے خاص طور سے ان اسکولوں میں جہاں صرف ایک استانی ہوتی ہے کچھ ریاستوں میں جہاں خواتین انسپکٹروں کا ایک مستقل عملہ نہیں ہے۔ معلمات نے مرد انسپکٹروں کے خراب سلوک، بلیک میل یا استحصال کی شکایت کی ہیں۔

خواندگی

اس تمام توسیع کے باوجود جو باضابطہ تعلیمی نظام میں ہوئی ہے ہندوستان کی عورتوں کی بہت بڑی اکثریت کی تعلیم تک رسائی نہیں ہے۔ ہے اور ناخواندہ ہے۔ اگرچہ عورتوں کی خواندگی کی شرح جو 1901 میں 0.69 فیصد تھی میں بڑھ کر 18ء4 فیصد ہو گئی اور فی ہزار مردوں کے مقابلے میں خواندہ عورتوں کی تعداد 68 سے بڑھ کر 435 تک پہنچ گئی تاہم ناخواندہ عورتوں کی تعداد بھی جو 51-1950 میں 16 کروڑ 19 لاکھ تھی بڑھ کر 71-1970 میں 21 کروڑ 52 لاکھ ہو گئی۔ اس کے مقابلے میں ناخواندہ مردوں کی تعداد 13 کروڑ 99 لاکھ بڑھ کر 17 کروڑ 20 لاکھ ہوئی۔ 15 تا 24 سال عمر کے گروپ میں 2 کروڑ 98 لاکھ یا 5ء67 فیصد عورتیں ناخواندہ ہیں۔ 25 سال اور اس سے اوپر عمر کے گروپ میں یہ تعداد بڑھ کر 9 کروڑ 45 لاکھ یا 6ء88 فی صد ہو جاتی ہے۔ عمر کے ان دونوں گروپوں میں جو تھوڑی سی تعداد پڑھی لکھی عورتوں کی ہے اس میں ایک بڑی اکثریت کو صرف پرائمری اور مڈل سطح کی تعلیم حاصل ہے۔

آنے والے برسوں میں تعلیمی ترقی میں اولیت کے اقدامات اور ترجیحات کا تعین کرتے وقت ناخواندگی کے اس وسیع ہوتے ہوئے خلا کے چیلنج کو ذہن میں رکھنا پڑے گا۔ اس رسمی و باضابطہ تعلیمی نظام کے تقاضوں کو جو صرف ایک اقلیت اور زیادہ تر نوعمر نسل کی ضروریات کا سامان بہم پہنچا سکتا ہے بالغ عورتوں کے اس گروپ کی تعلیمی ضروریات کے ساتھ متوازن کرنا ہوگا جو سماج کی کارکنوں اور ماؤں پر مشتمل ہے۔

□□□

(ماخوذ: ہندوستان میں عورت کی حیثیت، سنہ اشاعت 1998، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی)

محمد افروز عالم

کشمیر میں خواتین کی تعلیم کی علمبردار
بیگم ظفر علی

"بیگم ظفر علی 1900 میں سری نگر، جموں و کشمیر میں ایک ایسے گھرانے میں پیدا ہوئیں جو تعلیم اور ترقی پسندی کو اہمیت دیتا تھا۔ بیگم ظفر علی ماہر تعلیم، خواتین کی آزادی کی علمبردار اور سماجی کارکن تھیں۔ وہ ایک قانون ساز بھی تھیں۔ ان کا پہلا نام سیدہ فاطمہ حسین تھا۔ وہ خان بہادر آغا سید حسین کی بیٹی تھیں۔ ان کی والدہ سیدہ سکینہ سادات کا تعلق سبزوار ایران کے ایک سید خاندان سے تھا جو کشمیر کا ایک متمول کاروباری خاندان تھا۔"

کشمیر کی ایک ممتاز شخصیت بیگم ظفر علی کا ہندوستان کی تعلیمی تاریخ میں ایک اہم مقام ہے۔ایک اصلاح پسند کے طور پر ان کی خدمات تعلیمی اور سماجی اصلاحات، خواتین کو بااختیار بنانے کے حوالے سے بہت اہم ہیں۔20ویں صدی کے اوائل میں ایک ترقی پسند گھرانے میں پیدا ہونے والی بیگم ظفرعلی نے اپنی زندگی تعلیم کی ترقی کے لیے وقف کردی، خاص طور پرخواتین کے لیے ایک ایسے خطہ میں جہاں تعلیم تک رسائی زیادہ تر قدامت پسند سماجی اصولوں کے باعث محدود تھی۔بیگم ظفرعلی میٹرک میں کامیاب ہونے والی کشمیر کی پہلی خاتون تھیں۔ان کو خواتین کی آزادی کی کارکن ہونے اور تعلیم کے ذریعے خواتین کو بااختیار بنانے کے لیے کام کرنے کے لیے 1987 میں پدم شری سے نوازا گیا۔تعلیم کے حوالے سے بیداری پیدا کرنے کے لیے ان کی ثابت قدمی یقیناً غیر معمولی تھی۔

بیگم ظفرعلی 1900 میں سری نگر، جموں وکشمیر میں ایک ایسے گھرانے میں پیدا ہوئیں جو تعلیم اور ترقی پسندی کو اہمیت دیتا تھا۔ بیگم ظفر علی ماہر تعلیم، خواتین کی آزادی کی علمبردار اور سماجی کارکن تھیں۔ وہ ایک قانون ساز بھی تھیں۔ان کا پہلا نام سیدہ فاطمہ حسین تھا۔وہ خان بہادر آغا سید حسین کی بیٹی تھیں۔ان کی والدہ سیدہ سکینہ سادات کا تعلق سبزوار ایران کے ایک سید خاندان سے تھا جو کشمیر کا ایک متمول کاروباری خاندان تھا۔میٹرک کے امتحان میں کامیاب ہونے والی کشمیر کی پہلی خاتون تھیں۔ انھوں نے 1938 میں گریجویشن مکمل کیا اور اس کے فوراً بعد پوسٹ گریجویشن کیا۔ایسے وقت میں جب کشمیر میں لڑکیوں کی تعلیم کی عام طور پر حوصلہ افزائی نہیں کی جاتی تھی ان کے خاندان نے ان کی تعلیم کی حمایت کی۔ وہ کشمیر کی پہلی مسلم خواتین میں سے تھیں جنھوں نے رسمی تعلیم حاصل کی۔تعلیم کے لیے ان کی ابتدائی کوشش نے سماجی اور ادارہ جاتی طور پر خواتین اور اس درپیش آنے والی رکاوٹوں کو آسان کیا۔ انھوں نے ان

رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے اپنی زندگی وقف کی ۔ انھوں نے اپنے مستقبل کا آغاز ایک استاد کے طور پر کیا اور تعلیم کے میدان میں ایک مضبوط مصلح کے طور پر ابھریں۔

اپنی صلاحیتوں کی بنیاد پر انھوں نے وادی کے کئی مختلف اسکولوں میں ہیڈ مسٹریس کے طور پر خدمات انجام دیں۔خواتین کے حقوق پر پختہ یقین رکھنے والی بیگم ظفر علی وادی میں لڑکیوں کی تعلیم کے حوالے سے بیداری پیدا کرنے اور انھیں بااختیار بنانے کے لیے کوشاں رہیں۔ کچھ ہی عرصے بعد وہ کشمیر میں انسپکٹر آف اسکول کے طور پر بھی مقرر ہوئیں۔بیگم ظفر علی ایک عمدہ خطیب تھیں۔ وہ اکثر عوامی تقریر میں شامل رہتی تھیں تاکہ تعلیمی بیداری پیدا کی جا سکے۔وہ کئی عوامی تقریبات اور اسکولوں میں تقریر کرتی اور اس میدان میں وادی کی لڑکیوں میں حوصلہ پیدا کرتی تھیں۔ ان کی موجودگی اور ٹیچر کلب نے کشمیر کے شعور کو مزید تقویت بخشی۔ٹیچر کلب نے تقریبات اور عوامی اجتماعات کا اہتمام کیا اور اس کی بنیاد رکھنے میں بیگم ظفر علی کا اہم کردار تھا۔وہ کشمیر کی مہارانی تارا دیوی کے ساتھ ایک اہم رکن تھیں۔کلب کا مقصد خواتین کے مسائل اور ان کے حقوق کے بارے میں بات چیت تھا۔وہ ہندوستان میں خواتین کی تحریک کے حوالے سے ہونے والی گفتگو میں فعال رہتیں۔وہ لیڈیز کلب کی جنرل سکریٹری تھیں۔آزادی سے پہلے وہ آل انڈیا ویمن کانفرنس کی سکریٹری بھی تھیں۔وہ محکمہ تعلیم میں کئی عہدوں پر فائز رہیں اور مختلف عہدوں پر خدمات انجام دیں۔انھوں نے کئی اسکولوں میں بطور پرنسپل خدمات انجام دیں۔ انھوں نے ایک ایجوکیشن آفیسر کے طور پر کام کیا اور کشمیر کے اسکولوں میں چیف ایجوکیشن آفیسر کے ساتھ ساتھ چیف انسپکٹر کے طور پر بھی خدمات انجام دیں۔ایک چیف انسپکٹر کے طور پر انھوں نے اسکول میں مڈ ڈے میل کو بھی متعارف کروایا۔ اپنے ریٹائرمنٹ سے قبل انھیں تعلیم کے ذریعے بااختیار بنانے کے معاملے میں انتھک محنت کی وجہ سے ڈپٹی ڈائریکٹر ایجوکیشن کشمیر کے عہدے پر بھی مقرر کیا گیا تھا۔وہ سوشل ویلفیئر ایڈوائزری بورڈ جموں وکشمیر کی رکن بھی تھیں۔بیگم ظفر علی نے ایڈوائزری بورڈ کے ڈپٹی چیئرمین کی حیثیت سے وادی میں خواتین کے لیے ایک فنی تربیتی مرکز بھی قائم کیا۔1977 سے 1982 کے درمیان وہ قانون ساز اسمبلی کی رکن بھی بنیں اور دیگر سماجی مسائل کے ساتھ ساتھ تعلیم اور خواتین کی آزادی کے لیے مختلف اصلاحات لانے کی کوشش کی۔انھوں نے جن پالیسیوں کی توثیق کی وہ بڑے پیمانے پر ترقی پسند اور خواتین کی بہتری کی طرف متوجہ تھیں۔

"بیگم ظفر علی کشمیر میں اسکولوں کی انسپکٹر کے طور پر خدمات انجام دینے والی پہلی خاتون تھیں، جو ایک پدرانہ معاشرے میں ایک اہم کارنامہ ہے ،جہاں خواتین کو قائدانہ کردار میں کم ہی دیکھا جاتا ہے۔ ان کی تقرری ان ترقی پسند تبدیلیوں کی علامت تھی جو کشمیر میں آہستہ آہستہ جڑیں پکڑ رہی تھی اور انھوں نے خواتین اور لڑکیوں کو تعلیمی پالیسیوں پر کافی اثر و رسوخ حاصل کرنے کا موقع دیا۔اسکولوں کے انسپکٹر کے طور پر انھوں نے وادی کشمیر میں لڑکیوں کی تعلیم تک رسائی کو بہتر بنانے کے لیے انتھک محنت کی۔ انھوں نے دور دراز علاقوں کے اسکولوں کا دورہ کیا، مختلف خاندانوں کو اپنی بیٹیوں کو اسکول بھیجنے کی ترغیب دی اور لڑکیوں کے لیے مزید اسکولوں کے قیام کی وکالت کی۔"

بیگم ظفر علی کشمیر میں اسکولوں کی انسپکٹر کے طور پر خدمات انجام دینے والی پہلی خاتون تھیں، جو ایک پدرانہ معاشرے میں ایک اہم کارنامہ ہے، جہاں خواتین کو قائدانہ کردار میں کم ہی دیکھا جاتا ہے۔ان کی تقرری ان ترقی پسند تبدیلیوں کی علامت تھی جو کشمیر میں آہستہ آہستہ جڑیں پکڑ رہی تھی اور انھوں نے خواتین اور لڑکیوں کو تعلیمی پالیسیوں پر کافی اثر ورسوخ حاصل کرنے کا موقع دیا۔اسکولوں کے انسپکٹر کے طور پر انھوں نے وادی کشمیر میں لڑکیوں کی تعلیم تک رسائی کو بہتر بنانے کے لیے انتھک محنت کی۔ انھوں نے دور دراز علاقوں کے اسکولوں کا دورہ کیا، مختلف خاندانوں کو اپنی بیٹیوں کو اسکول بھیجنے کی ترغیب دی اور لڑکیوں کے لیے مزید اسکولوں کے قیام کی وکالت کی۔ان کی رہنمائی میں لڑکیوں کے کئی اسکول کھولے گئے اور پرائمری اور سیکنڈری تعلیم میں لڑکیوں کے داخلے میں نمایاں اضافہ دیکھا گیا۔ان کی خدمات صرف تعلیم تک رسائی تک محدود نہیں تھیں۔ وہ فراہم کی جانے والی تعلیم کے معیار پر بھی گہری نظر رکھتی تھیں۔انھوں نے نصاب کو بہتر بنانے کے لیے کام کیا۔ اسے لڑکیوں کی ضروریات کے لیے

مزید جامع اور موزوں بنایا۔ وہ سمجھتی تھیں کہ خواتین کو بااختیار بنانے اور سماج میں تبدیلی لانے کی کے لیے تعلیم ایک ضرورت ہے نہ کہ محض ایک علامتی اشارہ۔ ان کی قیادت میں کشمیر کے اسکولوں نے جامع تعلیم پر توجہ مرکوز کرنا شروع کی میں پیشہ ورانہ تربیت بھی شامل تھی جس سے لڑکیوں کو معاشی طور پر خود مختار بننے میں مدد ملی۔

وہ سمجھتی تھیں کہ وسیع تر سماجی تبدیلی کے لیے اور کشمیر میں خواتین کو درپیش سماجی مسائل حل کرنے کے لیے خواتین کو تعلیم دینا بہت ضروری ہے۔ تعلیم کی وکالت کرتے ہوئے انھوں نے خواتین کے حقوق کی حمایت بھی کی اور ان جابرانہ رسوم ورواج کے خلاف جدوجہد کی جس نے خواتین کو ایک ماتحت مقام پر رکھا تھا۔ انھوں نے خواتین کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بننے والے سماجی اصولوں کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ بیگم ظفر علی کا خیال تھا کہ تعلیم غربت اور صنفی عدم مساوات کے دائرہ کو توڑنے کے لیے ایک طاقتور آلہ ہے۔ وہ عوامی زندگی میں خواتین کی شرکت کی زبردست حامی تھیں اور خواتین کو مختلف شعبوں میں قائدانہ کردار ادا کرنے کی ترغیب دیتی تھیں۔ یہ ایک قدامت پسند معاشرے میں انقلابی اقدام تھا۔ انھیں روایت پسندوں کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا جنھوں نے خواتین کے گھر سے باہر نکلنے کی مخالفت کی تھی۔

بیگم ظفر علی کا اثر تعلیم سے آگے حکمرانی اور عوامی خدمت کے شعبوں تک پھیلا ہوا تھا۔ جموں وکشمیر قانون ساز اسمبلی کی پہلی خاتون رکن کے طور پر انھوں نے خواتین کی بہبود اور تعلیم سے متعلق پالیسیوں کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔ انھوں نے اپنے پلیٹ فارم کا استعمال ایسی اصلاحات پر زور دینے کے لیے کیا جس سے خواتین اور لڑکیوں کو فائدہ پہنچے۔ خاص طور پر دیہی علاقوں میں جہاں تعلیم اور صحت کی دیکھ بھال تک رسائی محدود تھی۔ ان کی آواز قانون سازی کے دائرے تک پھیلی جہاں انھوں نے خواتین کے حقوق، تعلیم اور سماجی انصاف سے متعلق قوانین پر کام کیا۔ وہ جموں وکشمیر میں خواتین کے حق رائے دہی کی تحریک میں ایک اہم شخصیت تھیں، جس نے خطے میں خواتین کے حق رائے دہی کو محفوظ بنانے میں مدد کی۔ ان کا سیاسی کیریئر برابری، انصاف اور پسماندہ برادریوں کی بہتری کے لیے ان کی وابستگی کے لیے نمایاں تھا۔ بیگم ظفر علی کی میراث ثابت قدمی، قیادت اور خواتین کو تعلیم کے ذریعے بااختیار بنانے کے لیے تاحیات وابستگی ہے۔ ان کے تعاون نے کشمیر کے تعلیمی منظر نامے پر دیرپا اثر ڈالا ہے۔ آج انھیں ایک نمایاں معلم اور سماجی مصلح کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔ انھوں نے رکاوٹوں کو توڑا اور کشمیر میں خواتین کی آنے والی نسلوں کی تعلیم تک رسائی اور بااختیار بنانے کی بنیاد رکھی۔

بیگم ظفر علی کا سفر چیلنجوں کے بغیر نہیں تھا۔ انھوں نے مرد اساس معاشرے میں کام کیا جہاں خواتین کی تعلیم کو اکثر شک اور مزاحمت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ ثقافتی اصول خاص طور پر دیہی علاقوں میں لڑکیوں کو اسکول جانے سے روکتے ہیں ۔خاندان روایتی گھریلو کرداروں پر تعلیم کو ترجیح دینے سے گریزاں تھے۔ مزید ان کی زندگی میں کشمیر میں سیاسی عدم استحکام نے بھی اہم رکاوٹیں کھڑی کیں۔

حوالے

ڈار، جی ایم (2018)، کشمیر کے تعلیمی مصلح: ایک تاریخی تناظر، اورینٹ بلیک سوان۔

حسین، ایم ایس (2017)، بیگم ظفر علی: اصلاح پسند اور کشمیر میں خواتین کی تعلیم میں ان کی خدمات، جرنل آف کشمیر اسٹڈیز، 6(1)، 534۔

خان، آر اے (2021)، کشمیر میں خواتین کی تعلیم: علمبرداروں کا تاریخی تجزیہ اور ان کے اثرات، کشمیر جرنل آف سوشل سائنسز، 12(2)، 45-63۔

لالی، ایم اے (2015)، کشمیر میں خواتین کی بااختیاریت اور تعلیمی اصلاحات: بیگم ظفر علی کا کردار، نیو ہورائزن پریس۔

راشد، ایس (2020)، بیگم ظفر علی کی میراث: جموں وکشمیر میں خواتین کی تعلیم کی تشکیل۔ بین الاقوامی جرنل آف جینڈر اسٹڈیز، 9(3)، 76-88۔

شفیع، این (2019)، کشمیر کی بھولی بسری ہیروئنز: وہ معلم اور مصلح جنھوں نے خطے کی تشکیل کی۔ سری نگر پریس۔

وانی، اے ایس (2016)، بیگم ظفر علی اور کشمیر میں خواتین کی تعلیم کا ارتقا، تاریخی تحقیقی جریدہ، 4(2)، 15-29۔

سنگھ، آر پی (2014)، قدیم ہندوستان کا تعلیمی ورثہ، آریہ بک ڈپو۔

سوین، ایس (2011)، ہندوستان میں تعلیم کی تاریخی ترقی، ڈومینٹ پبلشرز اور ڈسٹری بیوٹرز۔

یونیسکو (1953)، ایجوکیشنل سروے آف انڈیا کی رپورٹ، یونیسکو پبلشنگ۔

Dr. Md. Afroz Alam

Asst. Professor

Maulana Azad National Urdu University

College of Teacher Education

Chandanpatti, Laheriasarai

Darbhanga-846002 (Bihar)

Mobile No. 8885472844

صدف صہیب خان

نعیمہ خاتون

طالبات کے لیے مشعل راہ

ہندوستانی تعلیمی اداروں میں خواتین کی نمائندگی گزشتہ برسوں نمایاں طور پر بڑھی ہے۔ تاہم ابھی قائدانہ کردار، اساتذہ کے عہدوں اور مجموعی مواقع میں مساوات کے حصول میں چیلنجز باقی ہیں۔ اگرچہ اساتذہ میں خواتین کی تعداد میں بتدریج اضافہ ہو رہا ہے، لیکن سینئر تعلیمی عہدوں پر ان کی موجودگی اب بھی کم ہے۔ شیوخ الجامعات، پرنسپلز، اور ڈینز جیسے قائدانہ عہدوں پر خواتین کی نمائندگی خاصی کم ہے۔

روایتی اصول اور صنفی تعصّبات بہت سی خواتین کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے یا اکیڈمیوں میں قائدانہ کردار ادا کرنے سے روکتے ہیں۔ دیہی اور پسماندہ علاقوں میں اسکولوں تک محدود رسائی، حفاظتی مسائل، اور تعلیم پر گھریلو ذمہ داریوں کو ترجیح دینے کے لیے سماجی دباؤ جیسی رکاوٹیں برقرار رہتی ہیں، جو لڑکیوں کو اسکول جانے سے روکتی ہیں۔

اگرچہ گزشتہ برسوں میں خواتین کی شراکت کو بڑھانے میں پیش رفت ہوئی ہے، خاص طور پر تعلیمی سطح پر، قیادت اور اساتذہ کے عہدوں میں صنفی برابری کے حصول کے لیے بہت زیادہ کام کرنا باقی ہے۔

اس جدوجہد کی مثال نعیمہ خاتون کی کہانی سے ملتی ہے، چار دہائیوں قبل ان کے خاندان کو ان کے مستقبل کے بارے میں ایک پرجوش بحث کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک ایسے دور میں جب اڈیسہ کی ایک نوجوان خاتون کے لیے ریاستی حدود پار کرنا انتہائی غیر روایتی تھا، نعیمہ کو اپنے بھائی کے ہمراہ اعلی تعلیم کے حصول کے لیے، جو اتر پردیش کی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کر رہا تھا، مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ خاص طور پر ان کے چچا نے اس تصور کی سختی سے مخالفت کی، اور خواتین کو اعلیٰ تعلیم کے حصول میں درپیش معاشرتی چیلنجوں کو اجاگر کیا۔

نعیمہ خاتون کا عزم اور ان کی والدہ کا تعاون اس وقت کی رکاوٹوں کو عبور کرنے میں کامیاب رہا۔ عزم مصمم کے اس ابتدائی مظاہرے نے نہ صرف ایک اہم ذاتی سنگ میل کا نشان لگایا بلکہ ان کی مستقبل کی کامیابیوں کی منزل بھی طے کی۔ ان کا اے ایم یو کا سفر محض ایک مادی اقدام نہیں تھا بلکہ یہ سماجی بندشوں کو توڑنے اور تعلیمی اور پیشہ ورانہ مہارت کے حصول کی طرف ایک مثبت قدم بھی تھی۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے نفسیات میں ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کرنے کے بعد، نعیمہ خاتون نے اگست 1988 میں اے ایم یو میں بطور لیکچرار اپنا پیشہ ورانہ سفر شروع کیا۔ مختلف مراحل سے گذرتے ہوئے وہ مسلسل ترقی کرتی چلی گئیں، اپریل 1998 میں ایسوسی ایٹ پروفیسر بنیں اور آخر کار جولائی 2006 میں پروفیسر کے عہدے پر فائز ہوگئیں۔ اپنے موجودہ کردار سے پہلے، انھوں نے شعبہ نفسیات کی پروفیسر اور صدر شعبہ کے طور پر خدمات انجام دیں، اور جولائی 2014 میں، وہ نسواں کالج کی پرنسپل مقرر ہوگئیں۔ اس عہدے پر، انھوں نے ادارے کے تعلیمی اور انتظامی پہلوؤں کو مضبوط کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ان کی قیادت نے ترقی اور خواتین اسکالرز کے لیے ایک معاون تعلیمی ماحول پیدا کرنے کی

اپنی صلاحیت کا مظاہرہ کیا۔

اپنی سابقہ کامیابیوں سے ہٹ کر، پروفیسر خاتون نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی شیخ الجامعہ کے طور پر اپنی اہم تقرری کے ساتھ تاریخ رقم کی۔ اپنے پیشرو پروفیسر طارق منصور کی مدت ملازمت کے اختتام کے بعد، اپریل 2023 سے یونیورسٹی مستقل شیخ الجامعہ کے بغیر چل رہی تھی۔ اس تقرری نے ایک صدی پرانی روایت کو توڑ دیا، جو یونیورسٹی کی باوقار تاریخ کا ایک اہم لمحہ ہے۔ پروفیسر نعیمہ خاتون اس باوقار عہدے پر فائز ہونے والی پہلی خاتون ہیں، جو ہندوستانی تعلیمی اداروں میں قائدانہ کردار میں صنفی مساوات کے حصول میں ایک اہم سنگ میل کی نمائندگی کرتی ہیں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی پہلی خاتون شیخ الجامعہ کے طور پر پروفیسر نعیمہ خاتون کی تقرری نہ صرف یونیورسٹی کے لیے بلکہ وسیع تر مسلم برادری کے لیے ایک تاریخی کارنامہ ہے۔

پروفیسر نعیمہ خاتون کی کامیابی مسلم لڑکیوں کو ایک مضبوط پیغام دیتی ہے کہ کوئی بھی خواب بہت بڑا نہیں ہوتا، اور یہ کہ محنت اور عزم کے ساتھ، وہ بھی رکاوٹوں کو توڑ سکتی ہیں اور اثر ورسوخ کے مقام حاصل کرسکتی ہیں۔ ان کی قیادت تعلیم کے میدان میں خواتین کی آنے والی نسلوں کے لیے نیا باب کھولتی ہے، جو تعلیمی قیادت میں صنفی مساوات کی طرف ایک ترقی پسند تبدیلی کا اشارہ دیتی ہے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اساتذہ انجمن (AMUTA) نے پہلے اس تقرری کے بارے میں تشویش کا اظہار کیا تھا، مگر بعد میں انجمن نے پروفیسر نعیمہ خاتون کی تقرری کو تسلیم کیا۔ انھیں لکھے گئے خط میں، انجمن کے اعزازی سکریٹری، پروفیسر عبید صدیقی نے امید ظاہر کی کہ وہ ایمانداری، شفافیت اور غیر جانبداری کے ساتھ قیادت کریں گی۔ انھوں نے اس بات پر بھی زور دیا کہ انجمن ادارے کے لیے ایک "وفادار نگران" رہیں گی۔ یونیورسٹی کے ترجمان، پروفیسر عاصم صدیقی نے واضح کیا کہ نئی شیخ الجامعہ کی بنیادی توجہ ادارے میں تحقیق اور تعلیم کو آگے بڑھانے پر مرکوز ہوگی۔

تعلیمی اور انتظامی دونوں شعبوں میں ایک ہمہ گیر شخصیت کے طور پر پروفیسر نعیمہ خاتون کافی تجربہ اور ایک ممتاز پس منظر رکھتی ہیں۔ ان کا وسیع تعلیمی سفر تحقیق، تدریس اور قیادت کے لیے گہری وابستگی سے مملو ہے، ان سب کا وسیع تر تعلیمی برادری پر نمایاں اثر پڑا ہے۔ علمی اور انتظامی مہارت کا یہ امتزاج یونیورسٹی کو ترقی اور اختراع کے ایک نئے دور میں لے جانے کے لیے اچھی جگہ مثال قائم کرتا ہے۔

بحیثیت شیخ الجامعہ پروفیسر خاتون نے اے ایم یو میں تعلیمی معیار کو بلند کرنے کے لیے ایک غیر متزلزل محنتوں کا مظاہرہ کیا ہے۔ ان کی قیادت یونیورسٹی کے پروگراموں اور اقدامات میں اختراعات اور بہتری لانے میں اہم کردار ادا کر رہی ہے۔ پروفیسر نعیمہ خاتون نے شمولیت کے کلچر کو فروغ دیا ہے اور ایسا ماحول بنانے میں کوشاں کر رہی ہیں جہاں متنوع نقطہ نظر کی قدر کی جائے اور علمی ارتقا کو بھر پور طریقے سے آگے بڑھایا جائے۔

پروفیسر نعیمہ خاتون نے روایتی طور پر کھلے دروازے کی پالیسی کو برقرار رکھا ہے، طلبا اور اساتذہ کو کی آزادانہ طور پر رابطہ کرنے کی روش کا خیر مقدم کیا ہے۔ یونیورسٹی میں تاریخ کی استاذ شیونگانی ٹنڈن کے مطابق، "ذاتی تجربے سے وہ درجہ بندی پر یقین نہیں رکھتیں۔ آپ ہمیشہ بلا تفریق ان سے شکایات یا مشورے کے لیے رابطہ کر سکتے ہیں۔"

توقع کی جاتی ہے کہ ان کی سرپرستی میں یونیورسٹی ترقی کے نئے مواقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی شاندار میراث کو آگے بڑھانا جاری رکھے گی۔ علمی اور ذاتی ترقی دونوں کے لیے سازگار ماحول کو فروغ دینے پر ان کی توجہ نے تعلیمی ارتقا کے مرکز کے طور پر یونیورسٹی کی ساکھ کو تقویت دی ہے۔ پروفیسر نعیمہ خاتون کی قیادت نہ صرف یونیورسٹی کی بھرپور تاریخ کا احترام کرتی ہے بلکہ اسے مستقبل کی کامیابی کے لیے بھی جگہ دیتی ہے، ان کی کوشش ہوگی کہ ادارہ ترقی اور علمی کامیابیوں کا مینار بنا رہے۔

ان باوقار کرداروں کو نبھا کر پروفیسر نعیمہ خاتون امید اور امنگ کا ایک استعارہ بن جاتی ہیں، جو مسلم لڑکیوں کو اپنے شوق کو آگے بڑھانے اور اپنے عزائم کا پیچھا کرنے میں معاون ومددگار ثابت ہوگا۔ اس طرح پروفیسر نعیمہ خاتون کی ذمہ داریاں نہ صرف ان کی انفرادی کامیابیوں کا ثبوت بنتی ہیں بلکہ تیزی سے ترقی پذیر تعلیمی منظر نامے میں ان کے نظم وضبط کی اہمیت کو بڑھانے کا ایک موقع بھی فراہم کرتی ہیں۔

* مضمون نگار ہمدرد پبلک اسکول نئی دہلی میں بارہویں جماعت کی طالبہ ہے۔

□□□

Sadaf Suhiab Khan
C/o. Dr. Suhaib Ahmad Khan
7, Jaswant Apartment
16-Jamia Nagar, Okhla
New Delhi-110025
suhaibahmad@rediffmail.com
+91 9953478474

ہاجرہ نور زریاب

اب نہ کوئی خط آئے گا

وہ بھی ایک زمانہ تھا
جب ہم اپنے پیاروں کو
کسی سفر پر رخصت کرنے لگتے تو
بھیگی آنکھوں سے ان کے حق میں دعائیں کرتے تھے
اور ہمیشہ کہتے تھے
پہنچ کے اپنی منزل پر خیریت کا خط لکھنا
اور پھر ہفتوں دیکھتے تھے
رستہ خط کے آنے کا
اک دن خط آجاتا تو عید ہماری ہوجاتی
وہ چھوٹا سا خط پڑھ کر
ڈھیروں خوشیاں مل جاتیں
لیکن وقت نے کروٹ لی
اور زمانہ بیت گیا
اب وہ قدریں خواب ہوئیں
خط اب اپنے پیاروں کو کوئی کہاں لکھواتا ہے
یہ بے ہنگم مصروفیت خط کب لکھنے دیتی ہے

یہ تو سچ ہے
دور دراز سے لوگوں کی تصویریں آجاتی ہیں
اور آواز کے ساتھ ان کے
اب پیغام آجاتے ہیں
لیکن یہ سچ مان لے تو
اے میری مغموم نظر دیکھ لے رستہ لاکھ مگر
اب نہ کوئی خط لکھتا ہے
اب نہ کوئی خط لکھے گا
اب نہ کوئی خط آتا ہے
اب نہ کوئی خط آئے گا
اب نہ کوئی خط آئے گا

Hajra Noor Ahmed
Ganga Nagar Near Modern English School
Akola-444002 (M.S)
Mob: 9922318742
hajranoor71.hn@gmail.com

نوشین تبسم

دل کے ارماں

اگر میں کہہ دوں
جو دل میں ہے تو
بکھر ہی جائے گا
پل میں سارا
محبتوں کا
یہ گھر ہمارا
ہر ایک دیوار
چاہتوں کی
بس ایک پل میں
گرے گی آخر
کسی کو کوئی
خبر نہیں ہے
میں روز لڑتی ہوں
خود سے اکثر
صبر کر کے
کچل کے ارمان
دل کے اپنے
تمام خوشیوں کو
روند کر میں
غموں سے سمجھوتہ
کر کے آخر
سمجھتی ہوں
سب فرائض اپنے
میں ہار کر بیٹھتی
نہیں ہوں
قدم بڑھاتی
رہوں گی آخر
ملے گی منزل

مجھے یقیں ہے
مرے مخالف
مری حمایت
کریں گے اک دن
بدل ہی جائے گی
میری قسمت
نکل ہی جائیں گے
دل کے ارماں
اسی لیے تو
میں خامشی سے
حیات اپنی گزارتی ہوں۔؛

Nausheen Tabassum
Sayyed Kaleem
Chikhli Road Amdapur
Dist. Buldana-444301 (M.S)

حسنِ سخن

ذاکرہ شبنم

دعا

1-یقیناً-زندگی میں دعاؤں کی
ضرورت تو سبھی کو ہے
لیکن بات جب بھی آئے دعا کی
مرادل کرتا ہے....
کوئی ایک دے مجھ کو
تو میں ہزار دوں اسکو...!

2-کسی کے دل سے ہمارے حق میں
محبت سے لبریز، بول دعا کے
گر بے ساختہ نکل جائیں
بکھری زندگی بھی سنور سکتی ہے
تقدیر بھی بدل سکتی ہے...!

3-دوسروں کی خاطر
تم کچھ ایسا کام کر جائیے
کہ-بن مانگے تمہیں
دعاؤں کا انمول تحفہ مل جائے
ایسی دعا کو تو
قبولیت کا درجہ حاصل ہے...!

4-اشکبار دعائیں اپنے اندر
اتنی تاثیر رکھتی ہیں
کہ-زندگی میں
خوشگوار مسکراہٹ کے رنگ
بکھیر دیتی ہیں....!

5-ستر ماؤں سے بھی
بڑھ کر چاہنے والا-جو-
شہ رگ سے بھی قریب تر
دونوں جہاں کا مالک
اک مرا رب ہی تو ہے
مانگوں میں اسی سے
جو سب کی سنتا ہے...!

Zakira Shabnam
C/O-Riyaz Ahamad
No-192.M-G.Market
Robertsonpet-K-G-F.563122
Kolar Dist.Karnataka.
Mobile-9916969954
zakirashabnam@gmail.com

عقبیٰ حمید

کچھ اس طرح سے تعلق ہمارا الجھا رہا
نہ ہم اس کے ہوئے اور نہ وہ ہمارا رہا

کہاں تھی اس میں کوئی بات سننے کی عادت
یہ میں ہی تھا کہ اسے اپنی سب سناتا رہا

نہ جانے کیوں نہیں مٹتی وہ ریت کی تحریر
اگرچہ اپنے ہی ہاتھوں سے میں مٹاتا رہا

اگرچہ بھول وہ جاتا تھا اپنے گھر کا پتہ
گلی میں میری مگر روز آتا جاتا رہا

گرچہ سرکشی لہروں نے گھیرے رکھا تھا
کنارہ دریا سے رشتہ جو تھا نبھاتا رہا

ہم اس کی باتوں کو یوں بیٹھے تھے عقبیٰ
مگر زمانہ ہمیں یاد سب دلاتا رہا

Uqba Hameed
Indira Nagar,
Munshi Puliya Sector 10/124
Lacknow-226016 (U.P)
Mob: 6394215523

زبیدہ شکیل

وہ ایک لڑکی

اداس لوگوں کی بستیوں میں
وہ تتلیوں کی تلاش کرتی
وہ ایک لڑکی
وہ نیک لڑکی
وہ عام چہرہ
وہ کالی آنکھیں
جو کرتی رہتی ہزار باتیں
مزاج سادہ
وہ دل کی اچھی
وہ کتنی سچی
محبتوں کا نصاب جانے
وہ جانتی ہے عہد نبھانے
وہ ایک لڑکی
خموش لڑکی
ذرا سی الجھی، ذرا سی سلجھی
نہ ناز جانے
نہ نیاز جانے
ستارے تکنا ہے اس کی عادت
ہے چاند ساتھی کرے شکایت
وہ ایک لڑکی
متین لڑکی
وہ سب سے غم چھپانے والی
وہ ہنسنے والی ہنسانے والی
وہ ایک لڑکی
عجیب لڑکی
امید رکھو تو پوری کردے
وہ بات پوری ادھوری کردے
کوئی بھی غم وہ سہہ رہی ہے
وہ سادہ باتیں ہی کہہ رہی ہے
وہ ایک لڑکی
حسین لڑکی
نظر جھکا کر چلنے والی
جو کل کے بارے میں سوچتی ہے
وہ ایک لڑکی
ذہین لڑکی
نرم سا لہجہ نرم سی باتیں
اداس دن ہے اداس راتیں
جو جھوٹے لوگوں کو سچا سمجھے
وہ ساری دنیا کو اچھا سمجھے
وہ کتنی سادہ وہ کتنی پگلی
وہ ایک لڑکی
خموش لڑکی------

Zubaida Shakeel
Vill. Dharampur Narayan Urf Tehai
Po. Rampur Hari
Ps. Minapur
Dist .Muzaffarpur-843117(Bihar)

آیت تنویر

پسِ پردہ

صابرہ جب ڈیڑھ مہینے میکے رہ کر دوسری بار سسرال آئی تو یہاں کی دنیا ہی بدلی ہوئی تھی۔ شادی ہونے کے بعد پہلی دفعہ جب آ کر تین دن رہی تھی تو ایسا نہیں تھا۔ اس کے شوہر محمد عباس کتنی محبت سے پیش آئے تھے۔ انھوں نے ایسا پیار دیا تھا کہ وہ اپنی قسمت پر نازاں تھی۔ مگر اب؟.... اب تو اسے اپنی بدقسمتی پر رونا آ رہا تھا۔ کہاں تو پہلے محبت کی خوشبو تھی اور اب شراب کی بدبو.... بات بات پر جھڑکیاں، تلخ جملے، اس کی قربت سے بیزاری، رات کے گیارہ بجے شراب پی کر بدمست ہو کر آنا اور بغیر بات چیت کیے سو جانا۔ اتنا تو سب کچھ صابرہ برداشت کر سکتی تھی مگر اسے جو بات سب سے بری لگتی تھی وہ یہ کہ عباس اپنی ماں کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ کوئی ایسی بات جو عباس کے مزاج کے خلاف ہو جاتی تو ماں کو ڈانٹ دیتا۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی ہاتھ اٹھانے پر آمادہ ہو جاتا تھا۔ ایسے موقعوں پر صابرہ سامنے آ جاتی تھی اور اسے سمجھاتی، ماں کے درجے اور مرتبے کا احساس دلاتی، خدا کے قہر و غضب سے ہوشیار کرنے کی کوشش کرتی۔

”دیکھیے، خدارا ماں کو کچھ نہ کہا کیجئے.... جو کچھ کہنا ہو مجھے کہہ لیا کیجیے.... ماں نے ہی آپ کو اپنا خونِ جگر پلا پلا کر اتنا بڑا کیا ہے.... ان کی دعاؤں کا ہی اثر ہے کہ آپ ہزاروں کما لیتے ہیں.... ماں کو دکھ پہنچا کر کوئی سکھ نہیں پا سکتا.... ماں کی آہ خدا کے غضب کو دعوت دیتی ہے....“

غرض ہر ہر طرح سے اسے سمجھاتی مگر توبہ کیجیے وہ کہاں سدھرنے والا تھا۔

صابرہ ایک مہذب، شائستہ اور مذہبی ماحول کی پروردہ لڑکی تھی۔ اس کی رگ رگ میں دین اور مذہب موجزن تھا۔ اس کا لباس، اخلاق، رہن سہن غرض ہر عمل شریعت کا پابند تھا۔ پھر بھلا وہ کیسے برداشت کر سکتی تھی کہ اس کا شوہر اپنے والدین کا نافرمان ہو کر خدا کے غضب کا شکار ہو۔

دن گزرتے گئے۔ یہ گھر صابرہ کے لیے ایک چھوٹا سا جہنم بن گیا تھا اور اس جہنم میں سلگتے ہوئے پانچ برس گزر گئے۔ اس دوران خدا نے اسے ایک چاند سا بیٹا عطا کیا، جو اب چار سال کا ہو چلا تھا۔ اس نے ہر ممکن طریقے سے اپنے شوہر کی اصلاح کی کوشش کی۔ ہر نماز کے بعد خدا سے گڑگڑا کر دعائیں مانگیں مگر ابھی اس کی آزمائش باقی تھی۔ اب تو اسے یہ فکر ہو گئی تھی کہ بیٹا سمجھدار ہو چلا تھا کہیں باپ کی عادتوں کا اثر اس پر نہ پڑنے لگے۔

اسی کشمکش میں صابرہ چڑچڑی ہو گئی۔ اب اس کی بھی ساس سے جھڑپ ہو جاتی۔ عباس یہ سب دیکھتا مگر کچھ نہ کہتا کیوں کہ وہ خود ہی اس جرم کا عادی تھا۔ اس کسیلے درخت کو تو اس نے خود لگایا تھا۔

ایک دن عباس شراب کے نشے میں دُھت رات کے آٹھ بجے ہی گھر پہنچ گیا۔ اندر قدم رکھتے ہیں ہی وہ چونک پڑا۔ اس نے دیکھا کہ ماں اور صابرہ میں خوب جنگ چھڑی ہوئی ہے۔ پچھلے پانچ برسوں میں تو کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ اِدھر سے ماں اسے جھڑکیاں، گالیاں دے رہی تھی اور اُدھر سے صابرہ انگلی نچا نچا کر ماں کو کھری کھوٹی سنا رہی تھی۔

عباس کو دیکھتے ہیں ماں نے چیخ کر کہا۔ ''لے دیکھ موت گاڑا.... تیرے ہی چلتے آج میں اس حال کو پہنچی ہوں....تو اگر ٹھیک رہتا تو کل کی اس چھوکری کی یہ مجال نہ تھی کہ مجھ سے منہ لڑائے....مجھے مارنے اٹھے... گالیاں دے....کوسنے دے....تیرے ہوتے آج یہ سب کچھ سننا پڑ رہا ہے....میری بدولت ہی یہ آ کر یہاں راج کر رہی ہے اور میرے ہی سر پر چڑھ رہی ہے....اور تو...بے غیرت...بے حیا..نمک حرام...احسان فراموش ...تو ہے کہ کچھ بولتا تک نہیں....کیا اسی دن کے لیے تجھے پالا پوسا تھا۔''

غرض ایک ہی سانس میں انھوں نے بیٹے کو کھری کھوٹی سنا ڈالی۔

یہ انسانی فطرت ہے کہ اگر وہ خود سے اپنے کوئی چیز برباد کر دے تو اسے اتنا افسوس نہیں ہوتا جتنا کہ دوسرا کوئی اس کی چیز کو نقصان پہنچا دے۔ یہی حال اس وقت عباس کا ہوا۔ اتنے دنوں تک تو وہ خود ہی ماں کو برا بھلا کہتا رہا تھا مگر اب ماں کی کھری کھوٹی نے اس کی غیرت کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ چنانچہ اس نے بڑبڑاتی ہوئی صابرہ کو چیخ کر ڈانٹا۔ ''صابرہ! اپنی زبان سنبھالو....اگر تم نے ماں کے لیے نازیبا الفاظ استعمال کیے تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔''

''اے ہے رے ماں کو چاہنے والے۔'' صابرہ نے انگلی نچا کر کہا۔ ''آج ماں کی طرفداری کرنے چلے ہیں....خود تو ماں کو مارنے تک اٹھ جاتے ہیں۔''

صابرہ کے یہ طنزیہ جملے کیا تھے، ابلتے ہوئے دودھ پر پانی کے چھینٹے تھے۔ ماں کی کھری کھوٹی باتوں نے جو جوش اس کی غیرت کو دیا تھا، صابرہ کے ان جملوں نے ٹھنڈا کر دیا۔ عباس کا اٹھا ہوا ہاتھ نیچے جھک گیا۔ اسے احساس ہوا کہ اصل مجرم تو وہ خود ہے۔ وہ تھوڑی دیر تک صابرہ کو عجیب نظروں سے دیکھتا رہا پھر کہا۔ ''تم ٹھیک کہتی ہو صابرہ....ٹھیک کہتی ہو۔''

اس وقت اس کا سارا نشہ ہرن ہو چکا تھا۔ اس نے ماں سے بڑی اپنائیت سے کہا۔ ''چلو ماں....کھانا دو۔''

برسوں کے بعد بیٹے کے منہ سے یہ سن کر ماں کا کلیجہ گز بھر کا ہو گیا۔ ان کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔

عباس کھانا کھا کر جب اپنے کمرے میں گیا تو اس نے ایک اور عجیب منظر دیکھا۔ صابرہ اپنے چار سالہ بیٹے نہال کو سگریٹ پلانے کی کوشش کر رہی تھی جس کی وجہ سے وہ کھانس کھانس کر دوہرا ہو جا رہا تھا۔

عباس نے حیرت اور غصے سے چیخ کر کہا۔ ''یہ تم کیا کر رہی ہو؟''

''وہی جو آئندہ ہونے والا ہے....آج نہیں تو کل سگریٹ ضرور ہی پئے گا اور پرسوں شراب بھی پئے گا....پھر کیوں نہ ابھی سے ہی عادی بنا دیا جائے تاکہ آگے چل کر....''

اس کی بات کاٹ کر عباس نے جھنجھلا کر کہا۔ ''کیوں جی جلا رہی ہو صابرہ؟''

''اس میں جی جلانے کی کیا بات ہے....آپ خود ہی سمجھدار ہیں۔''

عباس نے غصے میں صابرہ کے ہاتھ سے سگریٹ چھین کر کھڑکی سے باہر پھینک دی۔

عباس رات بھر بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ اسے بڑی بے چینی محسوس ہو رہی تھی۔ شام کے واقعے پر غور کرنا شروع کیا اور اپنے کردار کا محاسبہ کیا تو اسے اعتراف کرنا پڑا کہ ساری برائیوں کی جڑ وہ خود ہے۔ یوں تو وہ ماں کے ساتھ صابرہ کی چشمک عرصے سے محسوس کر رہا تھا مگر آج تو حد ہی ہو گئی۔ بھلا صابرہ اس حد تک جا سکتی ہے کہ ماں پر ہاتھ اٹھانے کو آ جائے۔ کچھ کرنا ہوگا....کچھ کرنا ہوگا....ایسا ہونے نہیں دوں گا۔

صبح کے پانچ ہی بجے تھے کہ صابرہ کو کسی نے جھنجھوڑ کر جگایا۔ صابرہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ نیند بھری آنکھوں سے دیکھا تو متحیر رہ گئی۔ آنکھوں کو مسل کر دیکھا کہ کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہی ہوں۔ عباس سر پر ٹوپی لگائے، چہرے پر ایک تازگی لیے اسے دیکھ رہا ہے۔

''ارے یہ کیا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی ہو؟'' عباس نے مسکرا کر کہا۔ ''کیا فجر کی نماز نہیں پڑھو گی؟''

''پڑھوں گی...مگر آپ....آپ تو نو بجے اٹھنے والے اتنی جلدی کیسے اٹھ گئے....اور یہ سر پر ٹوپی کیوں لگا رکھی ہے؟'' صابرہ نے حیرت اور مسرت کے ملے جلے لہجے میں پوچھا۔

''ارے بھئی، فجر کی نماز پڑھ کر آ رہا ہوں....کیا تم چاہتی ہو کہ میں ہمیشہ شرابی کبابی ہی بنا رہوں۔''

''نماز؟'' صابرہ خوشی سے چیخ پڑی اور جلدی سے چارپائی سے اتر کر ساس کے کمرے کی طرف بھاگی۔

''امّی....امّی....یہ دیکھیے جلدی آئیے....''

''امّی؟'' عباس حیرت سے بڑبڑایا۔ وہ سوچ رہا تھا، شام ہی ماں کو جلی کٹی سنا رہی تھی اور ابھی؟ یہ کیا ماجرا ہے؟

''ارے بیٹی کیا بات ہے؟'' ماں نے حیرت سے پوچھا۔ ''صبح صبح بہت خوش نظر آ رہی ہے؟''

''ہاں امّی! بہت خوش ہوں....آج سورج مغرب سے نکلا ہے.... آپ بھی خوش ہو جائیں گی....پہلے چل کر تو دیکھیے۔''

ماں نے بھی سوچا، آخر ایسی کون سی انہونی ہو گئی، ذرا چل کر تو دیکھا

جائے۔ ماں صابرہ کے ساتھ اس کے کمرے میں پہنچی اور عباس کا وضع قطع دیکھ کر وہ بھی حیرت میں پڑ گئیں۔

اچانک ماں کھل کھلا کر ہنس پڑیں۔ ہنستے ہنستے رونے لگیں۔ وہ بہ یک وقت ہنس بھی رہی تھیں اور رو بھی رہی تھیں۔ روتے ہوئے انھوں نے کہا۔ ''مان لیا صابرہ تیری حکمت کو....واقعی تو ایک عقل مند بہو ہے....آج میں تیرا اور عباس کا صدقہ اتار کر مٹھائی تقسیم کروں گی۔''

''دیکھ لیا نا امّی؟....میں کہتی تھی نا؟''

''کیا مطلب؟'' عباس تصویرِ حیرت تھا۔

''ارے بیٹا....وہی کل والی لڑائی...اور اس سے پہلے روزانہ کی تو تو میں میں ....وہ بس تجھے سدھارنے کے لیے ایک ڈراما تھا....ورنہ میری بہو تو ہیرا ہے ہیرا۔''

''اور نہال کو سگریٹ پلانا بھی اس ڈرامے کا ایک حصہ تھا....سمجھے نہ بدّھو!'' صابرہ نے ہنستے ہوئے اس کی کمر میں چٹکی لی اور نماز کی تیاری میں لگ گئی۔

عباس نے ماں کو سینے سے لگا کر، آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ کہا۔'' مجھے معاف کر دو امّی!''

□□□

Aayat Tanweer

59, Chuna Shah Colony, F-Road,

P.O.: Azad Nagar(Mango),

Jamshedpur-832110 (Jharkhand)

Cell No.: 6204721537

E-mail: taroomani@gmail.com

Subscription Form "Mahnama Khwateen Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'ماہنامہ خواتین دنیا' کا/کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

145 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر.. بتاریخ..

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/145 روپے IFSC:CNRB0019009، A/C: 90092010045326 میں جمع کروا دیا ہے۔

آپ 'ماہنامہ خواتین دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail:magazines@ncpul.in

دستخط

فہیمہ مقصود خان

وجدان

کب سے وہ آتے جاتے ہوئے لوگوں کو تک رہی تھی ۔یہ شاید اس کا روز کا مشغولہ تھا۔کھڑکی کی دیوار سے ٹیک لگائے کب اس کا سارا وقت گزر جاتا اسے احساس ہی نہیں رہتا۔ بس دیوانوں کی طرح آنکھیں راستے پے بچھائے رکھتی ۔ جیسے جیسے سورج ڈھلنے کے قریب ہوتا شام کے سائے میں اس کی آنکھوں کی چمک میں مزید اضافہ ہوتا جاتا۔

"منار! کیا پاگل ہو تم؟" سحر کی تاسف بھری آواز ابھری۔

ایک لمحے کے لیے اس نے مڑ کر دیکھا اور واپس گردن گھو مالی۔

"چھوڑ دو اس کا انتظار۔۔۔۔آنے والا ہوتا تو کب کا آجاتا اتنا وقت گزر گیا۔وہ تو بھول چکا ہوگا شاید تمہیں"۔

"تم نے محبت کی ہے؟" منار نے بنا پلٹے ہی اس سے سوال کیا۔

"نہیں! اور اللہ کرے کبھی ہو بھی نا۔تمھاری حالت دیکھنے کے بعد تو اس خیال کو ہی دل سے نکال لیا ہے کہ یہ روگ مجھ سے کبھی لپٹے"۔

سحر کی بات سن کے منار کا ایک کھوکھلا قہقہہ فضا میں بلند ہوا۔

اور کچھ لائنیں وہ منہ ہی منہ میں گنگنانے لگی۔

"میں کاک گلی دی بن جاوا
جے ماہی اڑادے پیرا نال"

"حالت دیکھو اپنی صدیوں کی بیمار لگتی ہو۔ وہ روپ رنگ کہا کھو گیا منار۔۔۔؟ ایسے زندگی گزارو گی؟ نا کھل کے ہنستی ہو نا کچھ بولتی ہو ۔یہ خاموشی ،اداسی ، تنہائیاں، ان سب سے باہر نکلو اور دیکھو زندگی کتنی خوبصورت ہے اور یہ بھی دیکھو کتنے لوگ ہیں تمھاری زندگی میں جو تمھیں ایسے دیکھ کے پریشان ہوتے ہوں گے"۔

"حالت دیکھو اپنی صدیوں کی بیمار لگتی ہو ۔وہ روپ رنگ کہا کھو گیا منار۔؟ ایسے زندگی گزارو گی ؟نا کھل کے ہنستی ہو نا کچھ بولتی ہو ۔یہ خاموشی ،اداسی ، تنہائیاں ، ان سب سے باہر نکلو اور دیکھو زندگی کتنی خوبصورت ہے اور یہ بھی دیکھو کتنے لوگ ہیں تمھاری زندگی میں جو تمھیں ایسے دیکھ کے پریشان ہوتے ہوں گے"۔
یہ تو روز کا معمول تھا سحر اور منار کا۔
منار روز اپنا دن کسی کے انتظار میں کاٹتی اور سحر اسے سمجھانے میں۔"

یہ تو روز کا معمول تھا سحر اور منار کا۔

منار روز اپنا دن کسی کے انتظار میں کاٹتی اور سحر اسے سمجھانے میں۔

سحر منار سے دو سال چھوٹی تھی۔ دونوں ہی بہنیں ماں باپ کی لاڈلی تھیں۔منار اپنے بابا کی کچھ زیادہ ہی لاڈلی تھی۔

اس لیے کہتے ہیں شاید۔۔۔لاڈلوں کو زندگی کا تھپڑ بہت زور سے لگتا ہے۔

منار ہمیشہ سے لڑکوں سے دور بھاگتی رہی ۔محبت کے نام پے ہمیشہ ہنسنے والی لڑکی کو لوگ کیسے اتنا چاہ سکتے ہیں۔

لیکن جب سفیر اس کی زندگی میں آیا تو اس کی محبت کی شدت سے، وہ خود کو بچا نہیں پاتی۔

ایک سال کے اس مختصر عرصے میں وہ صرف اس سے ایک دفعہ ملی وہ بھی چند لمحوں کے لیے۔

زیادہ تر وہ میسج اور کال پے ہی بات کرتے تھے۔وہ بھی سفیر کے اصرار پے۔کئی بار وہ اسے شادی کے لیے بول چکی تھی۔لیکن سفیر پتہ نہیں کیوں کبھی ہاں نا کہہ سکا۔

یوں منار نے دھیرے دھیرے اس سے رابطہ ختم کرلیا۔سفیر نے دو تین دفعہ کوشش کی لیکن منار کی سرد مہری سے اس نے بھی پھر رابطہ کرنے کی کوشش چھوڑ دی۔

سفیر سے رابطہ تو ختم کرلیا لیکن محبت ختم نا کرسکی۔

اس کے لوٹ کے آنے کا انتظار نا ختم کرسکی۔

"میں تمھیں کبھی نہیں بھول سکتا ۔ بہت محبت کرتا ہوں میں تم سے منار"۔

سحر کی باتیں سن کے منار کے کانوں میں سفیر کی آواز ابھری۔ ایسی ہی نا جانے کتنی باتیں تھیں سفیر کی جو روز شدت سے یاد آتی تھیں۔

میری روح دے من وچ توں سدا
تینوں یار بھلاناں اوکھا

"اسے بھلانا مرے بس میں نہیں۔سفیر سے میں نے عشق کیا ہے۔ جانتی ہو؟ محبت کی آخری حد عشق ہے۔اور میں اس حد کو پہنچ چکی ہوں۔

جہاں اب واپسی کا میرے لیے کوئی راستہ نہیں۔ میں لاکھ کوشش بھی کرلوں اس کی باتیں، اس کی یادیں، اس کی محبت ، میں کبھی اس سے نہیں نکل پاؤں گی۔یہ سب میرے لیے کسی اثاثے کی طرح ہے۔

اب یہ محبت میری زندگی کے ساتھ ہی ختم ہوگی۔ جب تمہیں کسی سے عشق ہوگا تب سمجھ میں آئے گا۔روح میں بسنے والے روح کے ساتھ ہی نکلتے ہے۔

وہ ضرور آئے گا۔کوئی تو شام ایسی ضرور آئے گی جب وہ میرے گھر میں موجود ہوگا۔منار کی آنکھوں میں آس کے جگنو جھل مل کرنے لگے۔

"اچھا تو پھر کیوں اس نے تم سے کبھی شادی کا وعدہ نہیں کیا؟ کیوں ہر بار وہ انجان بن گیا؟ یہ کیسی محبت ہے اس کی کہ شادی کے بارے میں وہ سوچ نہیں سکتا پر محبت ضرور کرسکتا ہے "سحر بھی بھلا خاموش رہنے والوں میں سے تھی۔

"یہی بات تو اکثر مجھے بھی الجھن میں ڈال دیتی ہے کہ کیوں وہ وعدہ نہیں کرسکا۔

چاہے تو وقت مانگ لیتا جتنا چاہے اتنا میں انکار نہیں کرتی۔"

منار ایک سرد آہ نکالتے ہوئے بولی۔

"ابو سے بات کر کے دیکھو۔یوں گھٹ گھٹ کے کب تک جیوں گی۔ابو لے کر جائیں گے تمھارا رشتہ اس کے گھر"۔

سحر اس کا جواب جانتی تھی پھر بھی وہی بات دوہرا گئی۔

"تمھیں قسم ہے میری میرے ماں باپ کے سامنے مجھے کبھی رسوا نا کرنا۔ میں نہیں چاہتی کہ وہ اس کے در سے خالی ہاتھ لوٹیں اور انہیں یہ پتا چلے کے ان کی بیٹی نے ایک لا علاج روگ پالا ہوا ہے۔وہ بھی ایک ایسے شخص کے لیے جو گھر بسا نہیں سکتا لیکن اپنی محبت سے کسی کو اجاڑ ضرور سکتا ہے۔"

اتنا کہہ کے اس نے کھڑکی بند کردی اور سونے چلی گئی۔

پیچھے سحر اس کی کم عقلی پے افسوس کرتی رہ گئی۔

"آخر اسے ہوا کیا ہے ڈاکٹر صاحب کوئی دوا اس پر اثر نہیں کرتی ۔ دن بہ دن اس کی حالت کیوں بگڑتی جارہی ہے۔ جتنا اس کا علاج کررہے ہیں وہ مزید کمزور ہوتی جارہی ہے۔"

منار کی دن بہ دن بگڑتی طبعیت اس کے ماں باپ اور ڈاکٹر کی سمجھ سے باہر تھا۔سوائے سحر کے جو چاہ کے بھی نہیں بتا سکتی تھی کہ کسی کی جھوٹی محبت کے الفاظ ان کی بیٹی کو موت کے منہ تک لے آتے ہیں۔

ہزاروں طبیبوں سے وہ اس کا علاج کروا چکے تھے لیکن اس کی حالت میں کوئی فرق نہ آیا۔

یوں ہی دن بیت رہے تھے اور ایک دن جب سورج اپنی پوری آب و تاب سے جگمگا رہا تھا۔اس نے سفیر کے نام کچھ لکھ کر محفوظ کرلیا۔

جو چمک منار کی آنکھوں سے غائب ہوگئی تھی، وہ آج پھر سے نظر آرہی تھی۔

جیسے جیسے دن ڈھل رہا تھا منار کی حالت بگڑتی جارہی تھی۔

"سحر" مشکل سے اس کی آواز نکل رہی تھی۔

سحر اس کے سرہانے بیٹھی آیات دم کررہی تھی۔

"بولو میری جان میں یہیں ہوں"۔سحر اس کی پیشانی پے آئے پسینے کو صاف کرتے ہوئے بولی۔

"میں نے۔۔۔سفیر۔۔۔۔۔۔کے۔۔۔نام یہ۔۔۔لیٹر لکھا ہے وہ جب بھی آئے گا۔۔۔۔اسے دے دینا۔۔۔اور۔۔۔امی۔۔۔بابا کا بہت خیال رکھنا۔۔۔۔۔جو غلطی مجھ۔۔۔سے سرزد ہوئی تم مت کرنا۔۔۔کسی کو۔۔۔چاہو تو۔۔۔ایک حد تک ۔۔۔کہ اس کے جانے کے بعد تم ۔۔۔۔زندہ رہ سکو۔۔۔کسی کی جدائی کو زندگی بھر کا۔۔۔۔۔روگ نہیں

۔۔۔بتانا۔۔۔

بابا۔۔۔کو کبھی نہیں بتانا۔۔۔۔کہ۔۔۔ان کا غرور۔۔۔ان کی منار ۔۔۔۔نے۔۔۔زندگی میں۔۔۔ایک غلطی کی۔۔۔کسی سے عشق کر بیٹھی۔۔۔"

"نہیں بتاؤں گی تم ٹھیک ہوجاؤ بس" سحر کی سسکیاں ابھرنے لگیں۔

شام کا سایہ گہرا ہوگیا سورج غروب ہوگیا۔ایک جھٹکے سے منار کی سانس اکھڑی سحر کے ہاتھوں سے منار کا ہاتھ چھوٹ گیا۔ہونٹوں پے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ آنکھیں کھلی رہ گئیں۔

تھوڑی دیر میں ہی گھر محلے اور رشتے داروں سے بھر گیا۔

ہوش وہواس کھوئی سحر کی نظر اچانک سفیر پے پڑی جو نا جانے کہاں سے آ گیا تھا۔دل چاہا کے اس کا گریبان پکڑ کے بولے تمہارے کھوکلے داوے تمھارے انتظار کی حسرت لیے وہ چلی گئی ۔

چیخے چلائے اور وہاں موجود ہر شخص کو بتائے یہ ہے منار کا قاتل اس نے لی ہے منار کی جان، پر وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی۔

مرنے کے بعد اپنی بہن کا تماشہ نہیں بنا سکتی تھی۔

وہ خاموشی سے اٹھی اور منار کے کہنے کے مطابق اسے لیٹر تھما آئی۔

شام سے رات ہوگئی اور جنازے کو بھی لے جانے کا وقت ہوگیا۔

منار کے بابا کے بعد سفیر نے کاندھا دیا اور سب لوگ منار کو اس کے آخری گھر عزت واحترام سے چھوڑ آئے۔

سب چلے گئے سفیر وہیں پر بیٹھا رہا۔جانتا تھا نام منار ہے پر اندھیرے سے ڈرتی ہے وہ۔

اسے لیٹر کا یاد آیا تو موبائل کی ٹورچ آن کر کے وہیں پر بیٹھ کر پڑھنے لگا۔

"مجھے معلوم تھا تم ضرور آوگے یقین ہی کچھ ایسا تھا تم پے۔۔۔۔

تمھاری محبت پے، میرا دل کہتا تھا تمھاری محبت جھوٹی نہیں ہوسکتی۔اس لیے تمھاری محبت میں پور پور ڈوبتی چلی گئی ۔ میں محبت کا مذاق اڑانے والی لڑکی ،محبت نے میرا ہی تماشہ بنا دیا۔۔۔۔۔۔

بہت خواہش تھی اپنا نام تمھارے نام کے ساتھ جوڑنے کی پر ایسا نا ہوسکا۔(شاید تمھاری کوئی مجبوری ہوگی۔۔۔کاش تم کوئی آس تھما دیتے تو میں تھوڑا اور جی لیتی)میری حالت دن بہ دن بگڑتی جارہی ہے۔

جانے کا وقت قریب آرہا ہے ۔

تمھارے دیدار کی حسرت لیے ہی جارہی ہوں۔۔۔۔۔اور محشر میں ملاقات کی خواہش مند ہوں۔۔۔۔۔۔

ایک اور خواہش ہے جسے ضرور پورا کرنا۔جب بھی تمھیں میرے مرنے کی خبر ملے میری قبر پے گلاب لے کر آنا۔ہر لڑکی کی طرح مجھے بھی اپنے محبوب سے گلاب چاہیے تھا جسے میں بھی سنبھال کے سب سے چھپا کے کتابوں میں رکھتی پر ہم کبھی ملے ہی نہیں ۔۔۔۔۔نہ ہمارے بیچ کبھی پھول جیسے تحفوں کا لین دین ہوا۔

اس لیے اب میری قبر پر ضرور چڑھانا۔میں ہاتھوں میں تو نا لے سکی کبھی پر محسوس کروں گی کہ پھولوں کا نذرانہ میرے محبوب کی طرف سے ہے۔

ایک بات سفیر۔۔۔۔۔اپنے دل میں کوئی رنج وملال نا رکھنا ۔ مجھے تم سے کوئی شکوہ کوئی شکایت نہیں ہے۔

میں نے تھیں معاف کیا۔میرا ہر آنسو جو تمھارے لیے میری آنکھ سے نکلا میں نے وہ بھی معاف کیا۔

میرا دل جو تمھاری بے رخی سے کئی بار ٹوٹا میں نے وہ بھی معاف کیا۔

میں نے تمہیں معاف کیا سفیر۔میں نے تمہیں معاف کیا۔میری موت کے الزام سے میں تمہیں باعزت بری کرتی ہوں ۔اور اپنی محبت سے تمھیں ہمیشہ کے لیے آزاد کر رہی ہوں۔۔۔۔۔۔۔

خوش رہو۔خیال رکھنا اپنا ۔

جب میرا ذکر ہو
میرے مرنے کے بارہ برس بعد بھی
اگر کہیں یا کبھی
جب میرا ذکر ہو
اور پلکیں تیری
تجھ کو نم سی لگیں
تو میں یہ سمجھوں گی
میں نے تجھ کو پالیا ہے
میں نے تجھ کو پالیا۔۔۔"

تاریکی میں ڈوبا قبرستان سفیر کی سسکیوں سے گونج اٹھا۔

❑❑❑

Fahmina Maqsood Khan
Samta Nagar
Aurangabad-431101 (M.S)
Mob: 9834634299
E-mail: falkkhan1644@gmail.com

صائمہ پروین

برقع اٹھتے ہی چاند سا نکلا

''میں سسرال سے پورے تین سال بعد میکے آئی تھی۔''

شام میں ابا بلانے کے لیے آئے ہوئے تھے۔دوسرے دن دوپہر میں جانا تھا تو صبح اٹھ کر تیاری کر لی تھی جلدی کھانا بھی بنا لیا تھا کہ راستے میں بھوک لگے گی تو کھالیں گے۔گھر سے کچھ دور سڑک پہ کھڑی بس کا انتظار کر رہی تھی۔کچھ دیر میں بس آئی تو اپنا نقاب سنبھالتے ہوئے سوار ہوئی اور ابا کو بھی سہارا دے کر بس پہ سوار کیا۔میں کھڑکی کے پاس جا کر بیٹھ گئی جس سے راستے میں سبز و شاداب درخت،لہلہاتے ہوئے کھیت،لہراتی ہوئی ندیوں کا پانی دیکھتے جا رہی تھی،ایسا سماں روشن تھا کہ من کو سکون اور ایک تراوٹ مل رہی تھی۔جس سے روح کو ٹھنڈک محسوس ہو رہی تھی۔یہ سب دیکھتے دیکھتے کئی شہر اور گاؤں گزرتے گئے۔راستہ اتنا طویل تھا کہ طے کرنے میں کئی گھنٹے لگ گئے۔ابھی سیتا پور آنے میں کچھ ہی وقت رہ گیا تھا کہ کنڈکٹر نے آواز لگائی۔بی بی جی آپ کا اسٹاپ آنے والا ہے سامان صحیح سے رکھ لو بس زیادہ رکے گی نہیں۔اسٹاپ آیا تو بس سے جلدی جلدی اترے۔وہیں اسٹاپ سے کچھ دور ایک طرف کھڑکھڑے (تانگہ) والے کھڑے تھے جو سواریوں کے آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ایک تانگہ سواریوں سے بھرا ہوا کھڑا تھا جس میں ایک دو سواریوں کی کمی تھی اس پر میں اور ابا جا کر بیٹھ گئے۔کھڑکھڑے پہ بیٹھتے ہی وہ وہاں سے گھوڑے کو پچکارتا ہوا چل دیا۔سائیس گھوڑے کو تھوڑی تھوڑی دیر بعد چابک سے مارتا ہوا کھڑکھڑا چلاتا جا رہا تھا،گھوڑا ہنہناتا،گلے کی گھنٹیاں بجاتا اور پیروں کے گھونگھرو چھم چھم کرتا ہوا ٹاپوں سے گرد اڑاتا آگے بڑھ رہا تھا۔ادھر آہستہ آہستہ دن بھی ڈھلتا جا رہا تھا،آفتاب غروب ہو رہا تھا شفق کی سرخی آسمان میں لال دوپٹے کی مانند پھیلی ہوئی تھی۔ساتھ ہی ندی کے پانی میں ہوا سے پیدا ہو رہی تھی،پرندے چہکتے ہوئے اپنے آشیانوں کو اڑتے کہیں دور چلے جا رہے تھے اور اسی شفق کی سرخی میں کہیں غائب ہو جاتے۔سڑک کے اس پار کچھ کچے مکان دکھائی دے رہے تھے جنہیں دیکھتے ہوئے جا رہی تھی،''ابا کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔۔۔ابا۔۔۔اب دیکھنے سے تو لگ رہا ہے گاؤں کافی بدل گیا ہے اور لوگ بھی۔۔۔!''ابا نے بڑی مایوسی بھرے لہجہ میں کہا ''ہاں! زمانے کے ساتھ سب کچھ بدل جاتا ہے یہ تو لوگ ہیں پھر کیوں کر ایسے رہ جائیں گے۔۔۔''میں کچھ سوچتے ہوئے بولی۔۔۔ہاں ابا یہ تو ہے۔۔۔''۔ ابا اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہتے ہیں۔۔۔اب نہ گاؤں ویسا ہے نہ لوگ، پہلے تو کچھ دقت،پریشانی ہوتی تھی تو آدمی بنا سوچے سمجھے ننگے پیر دوڑا چلا آتا تھا۔اب ایسا وقت ہے نہ کوئی کسی کے گھر آتا ہے نہ جاتا ہے۔مکان تو جیسے کاٹنے کو دوڑتے ہیں جیسے شیطانوں کا گھر میں بسیرا ہو۔آدمی اپنا دکھ تو پہلے کسی نہ کسی سے بیان کر دیتا تھا،اب تو کوئی سننے کو راضی نہیں۔سن بھی لے تو مذاق بنا دیتا ہے۔سب کو صرف پیسے کی فکر ہے،وقت تو کسی کے پاس نہیں،یہاں تک کہ آدمی اپنے خاندان کو بھول بیٹھا ہے نہ کوئی ہمدردی،نہ

انسانیت آنکھ کا پانی مر گیا ہے ...خدا خیر کرے''۔ہم گھر کے قریب آ گئے تھے اوبڑ کھابڑ گرد غبار اڑاتا ہوا، ہچکولے مارتا ہوا ایسے لایا کہ ساری ہڈیاں برابر ہو گئیں.....!

''مکان میں داخل ہوتے ہی ڈیوڑھی میں قدم رکھا تو نظر باورچی خانے کی جانب گئی جو تین سال میں کافی پرانا ہو چکا تھا۔چھت میں دیمک لگ گئی تھی جس سے لکڑیوں کا برادہ گر رہا تھا، دیواروں کی چاروں جانب جگہ جگہ سیلن آ گئی تھی۔اسی میں اماں ایک طرف ٹوٹی ہوئی پٹری پہ دوپٹہ لپیٹے مٹی کے چولہے پہ کھانا بنا رہی تھیں، جیسے ہی سلام کیا دیکھتے ہی بولی۔۔ ''ارے! بٹیا..بے تحاشا دوڑ کر گلے لگا کر رونے لگی۔ اماں کے کانپتے ہاتھوں اور تھرتھراتی آواز نے مجھے بھی رنجیدہ کر دیا، ایسا لگا نہ جانے کب سے میرے آنے کا انتظار کر رہی ہیں۔''

مکان میں داخل ہوتے ہی ڈیوڑھی میں قدم رکھا تو نظر باورچی خانے کی جانب گئی جو تین سال میں کافی پرانا ہو چکا تھا۔چھت میں دیمک لگ گئی تھی جس سے لکڑیوں کا برادہ گر رہا تھا، دیواروں کی چاروں جانب جگہ جگہ سیلن آ گئی تھی۔اسی میں اماں ایک طرف ٹوٹی ہوئی پٹری پہ دوپٹہ لپیٹے مٹی کے چولہے پہ کھانا بنا رہی تھیں، جیسے ہی سلام کیا دیکھتے ہی بولی۔۔ ''ارے! بٹیا..بے تحاشا دوڑ کر گلے لگا کر رونے لگی۔ اماں کے کانپتے ہاتھوں اور تھرتھراتی آواز نے مجھے بھی رنجیدہ کر دیا، ایسا لگا نہ جانے کب سے میرے آنے کا انتظار کر رہی ہیں۔ کہنے لگیں..''راستے میں کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی۔'' چہرے سے نقاب اٹھاتے ہوئے نم آلودہ آنکھوں کو چھپاتے ہوئے جواب دیا..''نہیں اماں بالکل نہیں ابا ساتھ تھے پھر کیا پریشانی۔''''میں سوچ ہی رہی تھی کہ پتہ نہیں تمہارے ابا کہاں پہنچے ہوں گے''...اماں نے میرا چہرا دیکھا تو دیکھتی رہ گئیں۔ تھپتھپاتے ہوئے کہنے لگیں..''اللہ کہیں میری نظر نہ لگے بالکل چاند لگ رہی ہو''...میں نے ماتھا سکوڑ کر مسکراتے ہوئے کہا..''اماں...آپ بھی نہ...!''اماں ہنستے ہوئے ..''ٹھیک ہے نہیں کہتی بس..'' اماں کا جھری دار معصوم چہرہ اور ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں جیسے کوئی سوال پوچھ رہی ہوں۔لیکن اتنا ہی کہا..''چلو پھر تو اچھا ہے۔''تم تھک گئی ہو گی ابا اور تمہارے لیے چائے بنا دیتی ہوں۔اماں پھٹے ہوئے دوپٹے کے دامن سے آنسوں پوچھتے ہوئے چائے تیار کرنے لگیں۔ اتنی مسافت طے کرنے سے مجھے بہت تھکن محسوس ہو رہی تھی والدین کے ساتھ کھانا، پینا ہوا، کچھ باتیں ہوئیں۔بات کرتے کرتے کب آنکھ لگ گئی پتہ ہی نہ چلا۔

ابھی نصف شب ہی گزر رہی تھی کہ اچانک آنکھ کھل گئی، ارد گرد دیکھا تو سناٹا پسرا ہوا تھا۔آسمان بالکل صاف وشفاف تھا۔چاندنی رات پوری آب وتاب کے ساتھ جگمگا رہی تھی۔ پورے آنگن میں بکھری ہر شئے روشن تھی اور بڑی بھلی معلوم ہو رہی تھی۔نیم کے درخت کی آڑ سے چاند جیسے مسکرا رہا ہو۔ یہ دیکھتے ہوئے اس کے وجود پر رشک آ رہا تھا۔ میں اپنی جھونپڑی میں چارپائی پہ بیٹھی چاند کی اٹکھیلیاں دیکھ رہی تھی، ساتھ ہی میں اس کے وجود سے ہم آہنگ ہو رہی تھی اور اپنے ماضی کو یاد کر رہی تھی اور ماضی حال بن میرے سامنے کر رقص کر رہا تھا۔فرط طرب سے مجھے رونا آ رہا تھا۔سہانی سی آہستہ آہستہ ہوا چل رہی تھی جو مجھے اپنے حصار میں لے رہی تھی۔اسی چاندنی اور سہانی رات میں پرندوں کی کہیں دور سے گزرنے اور چہچہانے کی صدا سنائی دے رہی تھی، جیسے کہیں عاشق ومعشوق کی وصل کی رات ہو۔ یہ بالکل ویسی ہی رات تھی جب پہلی بار ابرار مجھ سے ملنے آیا تھا، ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے'ابرار میرے قریب ہی بیٹھے ہوں.....!

میں بالکل تن تنہا مغموم تھی۔ایک بے چینی سی ہو رہی تھی، ساتھ گزارے ہوئے لمحوں کا تصور آنکھوں میں ابھر رہا تھا۔ایسے خیال من میں پیدا ہو رہے تھے کہ ذرا دیر میں ہنسی آ جاتی تو ایک پل میں آنکھیں اشکبار ہو جاتیں۔صبیحہ اب ان چیزوں سے بالکل نامانوس ہو گئی تھی۔اس کا سجنا سنورنا اب پہلے کی طرح نہ تھا، نہ اس میں وہ شوخیاں رہ گئیں تھیں۔نہ وہ چال تھی نہ ڈھال چہرا بالکل اداس لگتا، آنکھیں اندر ہوں گئی تھیں، شادی سے پہلے کتنی کھلی کھلی رہتی تھی۔ بڑی بڑی آنکھیں، پیالے کی مانند ہونٹ اوپر سے ہونٹ کے اوپر تل چہرے پہ چار چاند لگا رہا تھا لمبے بال، گوری تھی قد سڈول تھا جو بھی دیکھ لے اس کا دیوانہ ہو جائے۔لیکن صبیحہ کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔لڑکیوں کی زندگی میں یہ وہ عمر ہوتی ہے جب ان کا حسن وشباب بلندی پر ہوتا ہے جہاں ایک طرف شرم وحیا کا پاس ولحاظ رکھنا پڑتا ہے تو

دوسری طرف دل لگانے کو جی چاہتا ہے۔لیکن صبیحہ نے گزرے ہوئے لمحوں کی یاد کے سائے تلے پوری رات رونے میں گزاردی۔

صبح دیر سے آنکھ ملتے ہوئے اٹھی تو آنگن میں دھوپ پھیلی ہوئی تھی جس سے کوٹھری کے اندر کھڑکی سے روشنی آ رہی تھی۔ ابھی سورج پوری طرح طلوع نہیں ہوا تھا۔اس کی لالی دور پہاڑوں سے ابھر رہی تھی۔ادھر بلبل چہچہا رہی تھی۔کوے کھانے میں جٹے کائو کائو کر رہے تھے۔میں اٹھ کر منہ دھلنے چلی گئی۔دوپٹے سے منہ پوچھتے ہوئی نکلی تو دیکھا اماں ناشتہ تیار کر چکی تھیں۔ مجھے بہت افسوس ہوا کہ دیکھوتو اماں نے جگایا بھی نہیں کیا سوچ رہیں ہوں گی...میں نے اماں سے ذرا خفا ہوتے ہوئے ہنوٹ کو ہلکا داتوں میں دباتے ہوئے کہا..''اماں...!ہاں....مجھے اٹھا دیا ہوتا میں ناشتہ بنا دیتی''...''اب تم کو اٹھاتی تو وقت لگتا اتنے میں تیار کر لیا۔تھوڑا اداسی بھری آواز میں بولیں..ویسے ہو ہی کتنے دن آج کر دیتی، پھر تو مجھے ہی کرنا ہے۔

.''اماں..کیسی بات کر رہی ہیں جب تک ہوں تب تک میں ہی کروں گی...''

معلوم ہے شادی ہوتے ہی ہم عورتیں تو جیسے بوجھ ہو جاتی ہیں...جس میں پیدا ہوتی وہی گھر پرایا ہو جاتا۔کون سی چیز کہاں رکھی ہم سے پوچھی جاتی عید ہو یا بقر عید صاف اور سجاوٹ سب کچھ دیکھتے آج ہم اپنے گھر سے پرائے ہو گئے...اماں صبیحہ کا سر اپنی گود میں رکھ لیتیں...اماں پھر اٹھنے لگیں تو فرط محبت میں، میں نے اماں کا ہاتھ پکڑا اور پلنگ پر بٹھا دیا اور خود کام کرنے لگی ،کام سے فارغ ہوئی تو آ کر باہر بیٹھ گئی۔

ابھی رات کا خیال ذہن سے نہیں اترا تھا،بیٹھی سوچ ہی رہی تھی کہ روبینہ آواز دیتے ہوئے ملنے آ گئی۔میری بچپن کی سہیلی تھی اکثر ہم دونوں ساتھ میں رہتے تھے گھر میں آنا جانا لگا رہتا تھا،اپنی ہر ایک بات اس سے بتایا کرتی تھی۔اس لیے روبینہ میرا چہرہ دیکھ کر ہر ایک بات جان لیتی۔لیکن آتے ہی پہلے اس نے میرے سسرال والوں کے بارے میں حال دریافت کیا۔طنز بھرے لہجہ میں مسکراتے ہوئے کہا..''تین سال میں تمھارے شوہر کو ایک دن کی بھی فرصت نہیں ملی کہ ایک بار بھی لے کر آ جاتے۔تم تو وہیں کی ہو کے رہ گئیں....''اس نے میری طرف بہت ہی تعجب سے دیکھتے ہوئے کہا..''صبیحہ!تو اس کا مطلب ہے تمھارا سہارنپور میں دل لگ ہی گیا۔مجھے تو لگ رہا تھا ایک پل نہیں رک پاؤ گی۔''میں ذرا سوچ میں ڈوب گئی۔میں نے جھوٹ ہی سر ہلا دیا۔پھر بھی اس کو اطمنان نہیں ہوا۔اس کے چہرے کی ہنسی غائب ہو گئی۔میرا ہاتھ پکڑ کر کہا....تم مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو....

''کیا بات ہے صبیحہ بڑی غم زدہ لگ رہی ہو؟''

''تمہارا چہرہ جو شمع کے مانند روشن تھا آج وہ بھی موم کی طرح پگھلا ہوا لگ رہا ہے۔''

میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے صرف ''ہاں''...میں جواب دیا اور خاموش بیٹھی رہی۔لیکن روبینہ نے بہت اصرار کیا...میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔گلا بھی سوکھ رہا تھا کیسے بولتی...روبینہ کو زور سے گلے لگا کر رونے لگی....

''روبینہ!مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا پوری رات یہی حال رہا۔''

''روبینہ نے میرا ہاتھ تھاما اور پریشانی ظاہر کرتے ہوئے کہنے لگی....ایسے کیوں رو رہی ہو سسرال میں کچھ ٹھیک نہیں ہے کیا؟''

آنسو پوچھتے ہوئے بولی...''نہیں!مجھے وہاں کوئی دقت نہیں۔''

''پھر؟روبینہ..جب سے آئی ہوں دوبارہ وہی منظر مجھے ماضی بن کر پریشان کر رہا ہے۔''

روبینہ فوراً سمجھ گئی کہ صبیحہ اب تک ابرار کی محبت کو اور ابرار کو بھلا نہیں پائی ہے۔اس نے پریشانی ظاہر کرتے ہوئے کہا...

''اچھا!تم تو کہہ رہی تھی ایسا کچھ بھی نہیں پھر اچانک کیا ہو گیا؟''

میں نے قصداً کہا...''معلوم نہیں۔''

روبینہ...اچھا معلوم نہیں ہے اس لیے ایسا حال ہے تمہارا صحیح کہا تم نے''معلوم نہیں''....روبینہ کچھ دیر بیٹھی پھر چلی گئی...

روبینہ کو اس بات کا علم تھا کہ جب بھی ابرار مجھے یاد کرتا ہے میرا حال ایسا ہی ہو جاتا ہے۔میری شادی ابرار کے ساتھ ہونی تھی لیکن تقدیر کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ابرار اور میں بچپن سے ایک ساتھ رہے،زیادہ تر وقت اسی کے ساتھ گزرتا تھا۔پت جھڑ کا موسم ہو یا برسات کی بہاریں، جاڑا ہو یا گرمی، ہر موسم کا لطف اسی کے ساتھ رہتے ہوئے اچھا لگتا تھا۔کم سنی سے لے کر جوانی کی بہاریں ساتھ میں گزاری تھیں۔نوعمری کے وہ حسین دن اور جوانی کی وہ دلکش راتیں ساتھ گزاریں۔ابرار کا وہ چلبلا پن،خوش باش چہرہ،شوخیاں،میری زندگی تھی۔پڑھنے میں اس کا ذہن بہت اچھا تھا۔وہ بارہویں کلاس میں تھا اور میں دسویں کلام میں۔شعر و شاعری کا بھی ذوق و شوق رکھتا تھا۔اکثر تنہائی میں درخت کے سائے میں بیٹھ کر شاعری لکھا کرتا۔اس کے والد ڈاکٹر تھے اور چاہتے تھے میرے ساتھ رہ کر کام سیکھ لے پڑھائی تو کر ہی رہا تھا ڈگری بھی مل جائے گی۔اس لیے وہ جب بھی اس کو دیکھتے اس پہ بہت غصہ کرتے..''اب تم شاعر ہی بن کے اٹھنا،کام تو تمہارے باپ دادا کریں گے...''جاؤ جا کر مریض کو دوا دے کر آؤ، مجھے ذرا ایک ضروری کام سے جانا ہے۔''ابرار چڑھتے ہوئے کہتا..ابو مجھے یہ کام پسند نہیں میں نہیں جاؤں گا دوا دینے۔''تو کیا کرو گے؟ شاعری ہی کرو

پھر تم..''کوا چلا ہنس کی چال...'' چار اچھر کیا پڑھ گئے اسی سے پیٹ بھرنا تم۔شام جب آئے تو ابرار لالٹین کی روشنی میں بیٹھا لکھ رہا تھا۔دیکھتے ہی اس کے والد اس پہ بھڑکنے لگے۔بہن دروازہ پکڑے کھڑی سن رہی تھی۔اس کے والد نے بہن کو مخاطب کرتے ہوئے کہا...''کہہ دو اس سے کہ چار پیسے کمائے پھر کھائے پسینے میں روٹی بور کر کھانا سیکھے پہلے۔'' کہتے ہوئے چلے گئے....

ابرار کا اور میرا مکان ذرا ہی دوری پر تھا۔وہ میرے گھر کسی نہ کسی کام کے بہانے سے آجاتا، مجھے بہت غور سے دیکھتا اور چپکے سے میرے ہاتھ میں خط دے جاتا۔میں اس کے خط کو سب کی نظروں سے بچا کر کوٹھری میں جا کر چراغ کی روشنی میں پڑھ لیتی۔اس خط میں نہ جانے کتنی محبت اور دنیا بھر کی باتیں ہوتیں۔وہ خط کے آخر میں یہ ضرور لکھ دیتا کہ میں تمہارے جواب کا انتظار کروں گا۔اس بارے میں، میں روبینہ سے بیان کرتی۔وہ اس میں میری مدد بھی کرتی۔جب میں خط لکھ اس سے کہتی کہ ابرار کو دے آئے تو مسکرا کر رکھ لیتی اور کہتی کہ ''دیکھوں تو تم نے اپنے محبوب کو کیا لکھا ہے''....لیکن وہ ایسا کرتی نہیں تھی.....شام کے لگ بھگ پانچ بجے کا وقت ہوتا، اس وقت کام سے فرصت پا کر میں دروازہ پکڑ کے کھڑی ہو جاتی۔اس کے آنے کی آہٹ سے میرے دل کی دھڑکنیں بڑھ جاتیں۔میرا چہرا کلی کی مانند کھل جاتا۔اسی طرح یہ سلسلہ چلتا رہا نہ چاہتے ہوئے بھی میں اس کے قریب ہوتی جا رہی تھی۔

ایک بار اماں بیمار ہو گئیں، ابا بھی کام سے باہر گئے ہوئے تھے، آدھی رات کا وقت تھا۔آسمان میں چاند روشن تھا، میں اماں کے پاس بیٹھی ان کے سر پہ پٹی رکھ رہی تھی، آہستہ آہستہ ہوا چل رہی تھی، پرندے چہچہا رہے تھے لیکن اماں کی طبیعت بگڑتی جا رہی تھی، مجبوراً مجھے ابرار کے گھر جانا پڑا۔اس کو بلا کر لائی کہ چل کر اماں کو دیکھ لے۔جو دوا دی اماں کو کھلا دی۔اس سے آرام ہوا تو اماں سو گیں، ابرار نے کہا اب میں چلتا ہوں کل پھر آجاؤں گا....اس کی اس بات میں کوئی اور بات لگ رہی تھی۔صبح کام میں مصروف تو رہی لیکن ابرار کے آنے کا خیال ذہن میں بار بار آرہا تھا۔جیسے دن گزرتا جا رہا تھا بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔شام ہونے جا رہی تھی ڈر بھی رہی تھی کہ آئے گا تو کیا بات کروں گی کیسے بولوں گی۔اس کے آنے کے ڈر سے کچی کوٹھری میں گندی پھٹی پرانی چٹائی کونے میں رکھی تھی اس کو اٹھایا تو نہ جانے کون سے زمانے سے اس پر گرد جمع تھی۔اسی کونے پہ ایک ڈبیہ (چراغ) کی روشنی میں چٹائی جھاڑ کر پڑھنے بیٹھ گئی۔اتنی گرمی تھی کہ پیاس کے مارے ہونٹ خشک ہو رہے تھے کہ اچانک اماں کے کھانسنے سے ان کی آنکھیں کھل گئی۔چاروں جانب دیکھا مجھے نہ پا کر آنگن سے آواز دی...

''اتنی رات گئے کوٹھری میں کیا کر رہی صبیحہ۔''ڈر کے مارے کانپنے لگی اور لرزش بھرے لہجے میں کہا...

''اماں... پڑھ رہی ہوں...''اتنی رات ہو گئے کیا پڑھ رہی؟ کوئی امتحان بھی تو نہیں ہے، چپ چاپ آ کر سو جاؤ۔اسی درمیان مجھے ابرار کی آواز سنائی دی۔اس کی آواز سے میرے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے۔مارے تھرتھراہٹ کے بول نہیں پا رہی تھیؤ بہت ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا تو مجھے دیکھتے ہی مسکرا رہا تھا۔میری تو جیسے آواز ہی نہیں نکل رہی تھی سامنے آتے ہی بولتی بند ہو گئی۔محبت کے جذبات دل میں ولولے پیدا کرنے لگے۔اس نے میرے کان میں کہا..تم مکمل میری ہو جاؤ....!کل تم مجھے بہت اچھی لگ رہی تھی جب سے گیا ہوں تم کو ہی سوچ رہا ہوں۔شادی کر لو مجھ سے....! میں جلدی سے شرماتے ہوئے کوٹھری سے باہر چلی آئی۔

اس کے بعد سے ہماری قربتیں اور بڑھنے لگیں، گھر میں جب یہ بات معلوم ہوئی تو ابرار کا میرے والدین نے آنا جانا بند کروا دیا۔میرے بی۔اے کے امتحان قریب آ گئے تھے وہ بھی اکیلے جانے سے منع کر دیا۔ابا ساتھ لے کر دلوانے جاتے۔سب کی پریشانیاں بڑھ گئیں کہ میرا جلدی سے کہیں رشتہ کرا دیا جائے۔میرے والدین نے ابرار کے والدین سے بات کی۔اگر اسی سے بات بن جائے تو اچھا ہے، بڑی مشکل سے اس کے گھر والے راضی ہوئے۔ابرار کی پھوپھو تو بالکل تیار نہیں تھیں۔ناک چڑھا کر بولی...''اگر شادی ہوئی تو میں اس شادی میں شریک نہیں ہوں گی کرتے رہنا تم شادی...''لیکن ابرار کی امی اور بہنیں مجھے مانتی تھیں اس لیے دونوں طرف سے رشتہ پکا ہو گیا۔جب ہماری شادی کے کچھ ہی دن رہ گئے، تیاریاں بھی کافی حد تک ہو گئی تھیں، خوشی کا ماحول تھا، ہر کسی کے چہرے پہ خوشی جھلک رہی تھی، گھر کو سجایا جا رہا تھا، مٹی میں ہرا رنگ ملا کر زمین اور دیواروں کی لپائی پوتائی ہو رہی تھی۔میری مہندی کا سامان شکیل کے گھر آچکا تھا کہ شام میں دولہن کو مہندی کون لگائے گا جا کر کسی کو بلا لاؤ....لیکن کیا معلوم تھا کہ مہندی لگنے سے پہلے ہی ڈھل جائے گی۔ادھر سے خبر آ گئی کہ ابرار کی والدہ کو اچانک دل کا دورا پڑ گیا۔پورے گھر میں خوشیوں کی جگہ ماتم چھا گیا تھا۔ان کا دنیا سے رخصت ہونا، اس بات سے ان کی پھوپھو کو گریز ہو گیا کہ اگر یہ لڑکی اس گھر میں آئی تو سارا گھر تہس نہس ہو جائے گا۔پھوپھو کی اب اور ناک بھوں چڑھ گئی۔ان کا تیور تو ساتویں آسمان پہ تھا...''اس منحوس کے ساتھ رشتہ لگتے ہی یہ حال ہوا ہے۔میں نے منع کیا تھا مان لیا ہوتا میرا کہنا تو آج یہ دن نہیں آتا۔سب اسی کی وجہ سے ہوا ہے''یہ سن کر میرے پیروں تلے زمین کھسک گئی۔منحوس لفظ میرے کانوں میں بہت دنوں تک

گونجتا رہا... یہی سوچتی تھی کہ واقعی میں منحوس ہوں...؟ کیا یہی میرا نصیب ہے؟ اس وقت ایسے حالات برپا تھے کہ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میرے والد مجھے لے کر بہت پریشان تھے۔

بالآخر ابرار کی پھوپھو کی باتوں میں آ کر اس کے گھر والوں نے شادی سے انکار کر دیا۔ جلد سے جلد اس کی شادی ماموں زاد بہن سے کروا دی گئی۔ ایک طرف اس کی امی کا جانا اور دوسری میری اس سے شادی نہ ہونا، اس سے وہ بالکل بے بس ہو گیا تھا۔ میری اس سے شادی ہونا ناممکن ہو گیا تھا۔

''ابا آئے اور ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا:'' کہ بیٹا اب یہاں رہ کر تو کچھ ہو نہیں سکتا چلو پھر سہارن پور چلنے کی تیاری کرو، میں تمھاری اماں سے بات کر کے اگلے ہفتے نکلنے کا بندوبست کرتا ہوں۔'' ہم سب اپنے چچا کے گھر آ گئے۔ چچا کے یہاں ہر دم خوشی کا ماحول رہتا، ہر وقت ہنسی مذاق، کھانا پینا ایک ساتھ ہوتا، ایک دوسرے کے ساتھ اتنا ارتباط ہو گیا کہ کسی دوسری طرف ذہن ہی نہیں گیا۔ میری چچی بھی بہت چلبلی تھیں۔ پل پل میرا خیال رکھتیں اپنے ساتھ ہی کام میں مصروف رکھتیں۔ دل کو ایک سکون سا محسوس ہونے لگا تھا۔ ایسا لگتا کہ زندگی اب پھر سے شروع ہوئی ہے۔ کبھی کبھی چچی کے ساتھ خریداری کرنے بازار چلی جاتی۔ چچی کو لکڑی کے چمچ بہت پسند تھے۔ ایک دن خریداری کرتے کرتے شام ہو گئی گھر واپس آئی تو دیکھا۔

ابا تنہائی میں کرسی پہ بیٹھے کچھ پڑھ رہے تھے جا کر ان کے پاس بیٹھ گئی۔ ابا کو کتاب لیے دیکھا تو ذہن میں سوال اٹھا، پڑھی لکھی ہوں تو کیوں نہ کسی اسکول میں پڑھانا شروع کر دوں۔ میں نے ابا سے کہا کہ...'' ابا! چچا سے بات کر لیجیے۔'' ابا نے میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا ''کس بارے میں بات کریں؟'' میں نے جھجکتے ہوئے کہا'' اسکول میں پڑھانے کے لیے۔'' ابا سوچنے لگے۔ پھر چند لمحے کے بعد بولے۔'' کیا کروگی نوکری کر کے...! ان کی اس بات میں ایک درد چھلک اٹھا۔ لیکن میں نے کہا۔'' نہیں ابا آپ نے اتنی محنت و مشقت سے مجھے پڑھایا ہے اتنا تو آپ کے لیے کر ہی سکتی ہوں۔ اپنے پیروں پر بھی کھڑی ہو جاؤں گی۔ ابا کے چہرے پہ ایک الگ ہی نور آ گیا جو اس سے پہلے شاید ہی دیکھا ہو۔ آنکھیں مسکرانے لگیں اور کہتے ہوئے چلے گئے'' اچھا ٹھیک ہے۔

اسکول میں پڑھاتے ہوئے کئی مہینے گزر گئے تھے۔ اسی اسکول میں ایک نوجوان انگریزی کے ماسٹر تھے۔ جمیل نام تھا۔ دل کے اچھے اور ہمدرد بھی لیکن تھوڑے شرارتی تھے۔ جب دیکھو تو مجھے ہی دیکھا کرتے۔ سمجھ میں نہیں آتا، آخر انھیں ایسے دیکھنے کی عادت ہے۔ یا کچھ اور بالآخر ان کی اس حرکت پہ مجھے بہت غصہ آتا۔ میں نے آخر ان سے کہا...'' دیکھیے صاحب! اوپر سے نیچے تک نگاہ دوڑاتے ہوئے... وہ فوراً بولے۔'' دیکھ ہی تو رہا ہوں۔'' مجھے غصے کے بجائے ہنسی آ گئی۔ ہنسی کی وجہ سے دوبارہ کچھ بول نہ سکی۔ کچھ دن گزرنے کے بعد ایک دن موقع پاتے ہی بہت کچھ سنا دیا۔ وہ بیچارے بنا کچھ بولے گردن جھکائے چلے گئے۔ مجھے بعد میں احساس ہوا کہ بنا سوچے سمجھے نہ جانے کیا کیا کہہ گئی۔ کئی روز گزر گئے جمیل صاحب نہیں دکھے تو میں بڑی پریشان ہوئی۔ اسکول میں اچانک نہ آنے سے اسٹاف بھی پریشان ہو گئے۔! مجھے یہ محسوس ہو گیا تھا کہ وہ میری ہی بات سے برا مان گئے ہیں اور نہیں آ رہے۔ بنا کسی کو بتائے میں نے ان کے گھر کا پتہ معلوم کیا۔ ان سے معافی مانگنے ان کے گھر پہنچ گئی۔ سلام کیا تو انھوں نے بڑی ہی محبت سے جواب دیا، بہت اچھے سے پیش آئے۔ جمیل سے مل کر ایسا لگا جیسے ان کو اتنا بھلا برا کہا تھا اس بات سے کوئی فرق ہی نہیں پڑا تھا نہ کوئی گلہ نہ شکوہ۔ شعاؤں سے جیسے نئی کرن نکل آئی، ہوا میں خمار کا سماں بندھ گیا... شبنم کے ہونٹ تھرتھرانے لگے جیسے کچھ کہنا چاہتی ہو، پر دل کی اس اجازت نہیں دے رہا تھا۔

میں نے انجان بن کر پوچھا..'' آپ اسکول کیوں نہیں آ رہے...''
جمیل..'' کیسے آتا تم نے اتنا اچھا سبق جو دیا تھا اسے بھلا نہیں پایا..'' صبیحہ کو بہت شرمندگی ہوئی اس نے بہت ہی آہستہ آواز میں کہا.. ۔اس دن بنا سوچے سمجھے پتا نہیں کیا کیا کہہ دیا تھا آپ کو....آئندہ ایسا نہیں ہوگا میں معذرت چاہتی ہوں....'' نہیں نہیں میں خود شرمندہ تھا اپنے کیے پہ کہ کہیں آپ جا کر کسی اور سے نہ کہہ دیں یہ سب سوچ کر بہت بیمار بھی ہو گیا تھا۔
'' ویسے ایک بات تم کو بتانا چاہتا ہوں کہ میرا دیکھنے کا مقصد یہ نہیں تھا کہ تم کو غلط نظر سے دیکھ رہا ہوں بلکہ یہ دیکھتا تھا کہ تم ایک دم چپ رہتی تھی نہ کسی سے بولنا نہ بات کرنا''۔ صبیحہ کا پل بھر کے لیے دل پسیج گیا آنسو پیتے ہوئے بولی...'' جمیل صاحب آپ کی بات تو کہیں نہ کہیں صحیح ہے لیکن یہ غم ایسے ہی چھپا رہے تو زیادہ بہتر ہے۔ زندگی میں کبھی ایسا طوفان آ جاتا ہے کہ بولتا ہوا انسان بھی چپ ہو جاتا ہے۔ کسی نہ کسی کی زندگی میں ایک ایسا طوفان ضرور آتا ہے کوئی دوسرا اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ آنکھوں میں آنسو ڈبڈباتے ہوئے اسی میں سوکھ گئے...'' صبیحہ نے ٹھنڈی آہ بھری...! جمیل سے کہنے لگی کہ...'' آپ کل سے اسکول آئیں اب کوئی کچھ نہیں کہے گا....'' کچھ دیر اسی سلسلہ میں بات ہوئی اس کے بعد گھر واپس آ گئی.....!

ابا میرا بے صبری سے انتظار کر رہے تھے۔'' کہنے لگے اماں کو

الجھن سی ہو رہی، گھر کے بارے میں سوچ سوچ کر دل بیٹھا جا رہا'' ۔ایک دو دن میں اماں کو لے کر گھر واپس آ گئے ۔آئے تو مکان میں بالکل اندھیرا تھا ۔لالٹین جلائی تو کچھ روشنی ہوئی ۔اماں پلنگ پہ بیٹھ کر مکان کی دیواروں کو تکنے لگیں ۔ہر ایک چیز پہ نظر دوڑا کر بولیں...''دیکھو تو اتنے دن گھر میں نہیں رہے سب سامان خراب ہو گیا ہے ۔زمین بھی پھول گئی ہے ..'' ۔میں نے کہا ..''اماں کوئی بات نہیں سب صحیح ہو جائے گا ۔ابھی آئیں ہیں وقت تو لگے گا ہی درست کرنے میں آپ اطمنان رکھو'' ۔کچھ دن تو ایسے ہی سہارن پور کا ماحول بنا رہا ۔

صبح صاف صفائی میں لگ گئی اتنی دھول مٹی جمع ہو گئی تھی ہر جگہ کہ اسی میں دو پہر ہو گئی ۔جلدی سے سب صحیح کر کے غسل کے لیے چلی گئی ۔آج سرخ رنگ کا جوڑا پہن رکھا تھا، ابرار کو بھی سرخ رنگ بہت پسند تھا ۔جب بھی پہنتی تو وہ ہمیشہ یہی کہتا..''تم سرخ جوڑے میں بہت خوبصورت لگتی ہو'' ،''ضرور مجھے دکھانے کے لیے پہنا ہوگا؟ میں غصے سے بول اٹھتی ...' 'میں تمھارے لیے کیوں پہنوں گی تم نے بنوا کر دیا ہے ۔ابرار پر سوز لہجے میں جواب دیتا.....نہیں! لیکن ایک دن تو ضرور پہناؤں گا...صبیحہ.....!

سہارنپور سے آئے ایک ہفتہ ہو گیا تو روبینہ ایک دن اس کا خط لے کر آئی ۔ابرار کو کسی طرح خبر ہوئی ہوگی کہ میں گھر آئی ہوئی ہوں ۔اس خط میں اس کی بے بسی اس کا درد اور میرے ساتھ بتائے ہوئے لمحوں کا ذکر تھا ۔اس کا خط پڑھ کر بہت روئی، اب کیا فائدہ ابرار ان باتوں کا جن کا کوئی وجود ہی نہیں ۔جب کبھی وہ پریشانی میں ہوتا مجھے یاد کرتا مجھے پوری رات نیند نہیں آتی ۔روبینہ سے پوچھا اس کے حالات تو تم کو ہی معلوم ہوں گے .. اس وقت تو وہ کچھ نہیں بولی چلی گئی...!

ٹھنڈ کا موسم تھا بہت سردی پڑ رہی تھی پر سکون ٹھنڈی ٹھنڈی مست ہوا چپکے چپکے جیسے کچھ کہہ رہی ہو جس کو چپ کے سنتی رہوں جیسے خوشی کی منزل بالکل قریب ہو ۔گھٹائیں چھا رہیں تھیں جیسے دل میں کچھ چھپا ہو ۔اس کو کسی سے کہنے کو دل کر رہا تھا ..اتنے میں ابا آ کر بولے کہ میں ایک دم سے چوک گئی ۔ابا نے مسکراتے ہوئے کہا...''سہارن پور جانے کا ارادہ ہے...؟'' میں ابا سے کیا کہتی ...کہا..''جیسا آپ بہتر سمجھیں ابا ۔'' ابا کے دل میں کچھ اور ہی تھا ۔اس لیے ہم دوبارہ سہارن پور چلے آئے ۔آ کر میرا رشتہ طے کر دیا ۔کیونکہ میری غیر موجودگی میں جمیل نے آ کر بات کر لی تھی ۔مجھے اس کی بھنک تک نہیں ہوئی ۔شادی کی ساری تیاریاں ہو گیں تھیں ۔بس باقی تھا تو میرا عقد ۔نکاح ہونے سے پہلے سرخ جوڑا آ چکا تھا ۔کوئی دوپٹہ اٹھا اٹھا کر دیکھ رہا تھا تو کوئی لال چوڑیاں کہ نکاح ہونے والا ہے ۔کسی کو بلاؤ دلہن کو تیار کرے ۔دیر ہو رہی ۔مجھ سے کوئی پوچھتا کہ میرے دل پہ کیا گزر رہی تھی اس وقت سرخ جوڑا دیکھ کر ایک دن ایسا تھا کہ پہننے سے پہلے ہی منحوس ہو گئی تھی...آہ صبیحہ زور زور سے رونے لگتی ہے...صبیحہ کی زندگی کی ایک نئی شروعات تھی جس میں خوشی بھی تھی اور درد بھی ۔میری شادی ہونے کے بعد میں یہیں کی ہو کر رہ گئی ۔جب تک والدین چچا کے گھر رکے میرا آنا جانا تھا کچھ دنوں بعد وہ بھی سیتا پور واپس چلے گئے ۔جب سے چچی کے گھر آنے کا موقع بھی نہیں ملا ۔جمیل پڑھنے پڑھانے کے کام میں اتنا مصروف رہتے کہ وہ بھی مجھے لے کر نہیں گئے ۔کیسے تین سال گزر گئے معلوم نہیں ۔

کل شام اپنے میکے آئی تو بہت کچھ بدل چکا تھا ۔روبینہ میری سہیلی کی بھی شادی ہو گئی تھی اس کے دو بچے تھے ۔روبینہ جانے سے پہلے دوبارہ آئی کہ شاید کچھ کہنا سننا ہو ۔اس کو ابرار کے حال کے بارے میں کچھ نہ کچھ پتہ رہتا تھا ۔ ۔جب میں نے اس سے ابرار کا حال دریافت کیا ۔اس نے بتایا کہ اب ابرار کے والد بھی نہیں ہیں ۔ابرار بالکل اکیلا رہ گیا ہے ۔بس اپنے ابو کی دکان سنبھالے ہوئے ہے ۔بہن تھی وہ بھی اپنے سسرال کی ہو گئی پھوپھو نے اپنا الگ مکان بنا لیا وہ وہیں رہتی ہیں ۔اس کی بیوی اب نہ اس کے ساتھ رہنا چاہتی نہ آنے کو راضی ہے ۔ابرار کی پھوپھی جو شادی توڑنے میں سب سے آگے کھڑی تھیں، آج وہ بھی پرسانِ حال نہیں ۔صبیحہ کی آنکھوں سے جھری کی مانند آنسو بہہ رہے تھے ہاتھ سے دوپٹہ اٹھا کر آنکھوں پہ رکھ لیا نس نس کر رونے لگی ۔یہی سوچ کر رو رہی تھی کہ ایک طرف جمیل جو میرے اچھے شوہر ہیں تو دوسری طرف ابرار میری محبت جن کو بھلانا ناممکن تھا ۔وہ اب اکیلا جی پائے گا؟ کون پوچھے گا اس کا حال؟ میرے بنا اس کی ساری خواہشات ادھوری رہ گئی تھیں ۔اس کا دوڑتے ہوئے آنا، اس کا مسکرانا، ابرار کا شگفتہ چہرہ، شوخ ادائیں شرارتیں یہی سب باتیں میں اپنے شوہر جمیل میں چاہتی تھی ۔جمیل میں سچی محبت کا احساس تو محسوس کر سکتی تھی لیکن ابرار جیسی محبت اور گرمی نہیں، میں حاملہ تھی اس لیے جمیل نے کچھ دنوں کے لیے بھیج دیا تھا ۔زیادہ رکنا مناسب نہ تھا کچھ دن میں رکی پھر مجھے جمیل لینے آ گئے.......!

❑❑❑

Syma Parveen
Ansari House, 431
Zakir Nagar (West)
Near Abu Bakar Masjid
Okhla New Delhi-110025

بیماریوں سے تحفظ

کیا بڑے بچوں کو متعدی امراض سے محفوظ رکھا جاسکتا ہے۔

بچوں کو کئی بیماریوں سے بچانے کی ضرورت ہے۔ ماں کو ان سے اچھی طرح واقف ہونا چاہیے۔ ان کے متعلق ڈاکٹر سے تمام ضروری معلومات حاصل کرنا چاہیے۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ بچے کو چیچک، دق، ٹٹانس، کالی کھانسی، ڈپتھیریا، پولیو اور خسرہ سے بچنے کا ٹیکہ پہلے ہی سال لگوالینا چاہیے۔ بعد میں ان بیماریوں سے ہمیشہ کے لیے محفوظ ہونے کے لیے وقتاً فوقتاً ان ٹیکوں کا اعادہ کراتے رہیں۔

بچے کو کس ترتیب سے مختلف بیماریوں کا ٹیکہ لگوائیں؟

اس کا دارومدار اس بات پر ہے کہ جس طبقہ یا ملک سے بچے کا تعلق ہے اس میں بیماریوں کی صورت حال کیا ہے۔ ہندوستان میں میرے خیال سے یہ اچھا ہے کہ بچے کو پیدائش کے تین مہینے کے اندر بی سی جی کا ٹیکہ لگادیا جائے۔ ڈی۔ پی ٹی اور پولیو کے قطرے چوتھے مہینے سے ایک ایک ماہ کے وقفے سے تین بار دینے چاہئیں۔ خسرہ کا ٹیکہ نو ماہ سے ایک سال کی عمر کے درمیان اور چیچک کا ٹیکہ ایک سال کی عمر میں لگانا چاہیے۔ ڈی۔ پی۔ ٹی اور پولیو کا پہلا بوٹسر اٹھارہ سے بیس ماہ کی عمر کے درمیان ہونا چاہیے اور دوسرا بوسٹر پانچ چھ سال کی عمر میں ہونا چاہیے۔ اس کے بعد ڈی۔ ٹی۔ (ڈپتھیریا، ٹٹانس اور ٹائیفائڈ) ہر پانچویں لگنا چاہیے تاکہ ان امراض سے مستقل طور پر حفاظت ہوسکے۔

کیا یہ تمام ٹیکے ہمارے ملک میں موجود ہیں؟

خسرہ کے ٹیکے کے علاوہ باقی تمام ٹیکے ہندوستان میں ہر جگہ موجود ہیں۔ بعض مقامات پر خسرہ کے ٹیکے بھی مہیا ہیں۔ لیکن اگر خسرہ کا ٹیکہ نہ بھی حاصل ہوسکے تب بھی باقی تمام ٹیکے ضرور لگوادینا چاہئیں۔

ٹیکوں کے سلسلہ میں کیا احتیاطیں ضروری ہیں؟ کیا ان احتیاطوں کو نہ برتنے سے کوئی پیچیدگی پیدا ہوسکتی ہے؟

ٹیکوں کے معاملہ میں بعض ضروری احتیاطیں ہیں جن کا خاص طور پر خیال رکھنا چاہیے مثلاً پولیو کا ٹیکہ بچے کو بیماری کی حالت میں نہ دینا چاہیے۔ بلکہ میں یہ کہوں گی کہ سارے ٹیکے اسی وقت لگائے جائیں جب بچہ پوری طرح تندرست ہو۔ اگر بچے کو زکام، کھانسی، دست، بخار یا خارش وغیرہ کی بیماری ہو تو اس زمانے میں ٹیکے نہیں لگوانا چاہیے۔ ان حالات میں ٹیکہ لگوانے سے پہلے ڈاکٹر سے ضرور صلاح لینا چاہیے۔ اگر بچے کو کبھی دورے پڑ چکے ہوں تو بھی ڈاکٹر کے مشورہ کے بغیر اسے ٹیکے نہ لگوائیں۔

مختلف قسم کے ٹیکے مختلف قسم کی پیچیدگیوں کو جنم دے سکتے ہیں۔

سب سے پہلے ہم اس ٹیکے کو لیتے ہیں جس سے کوئی پیچیدگی پیدا نہیں ہوتی۔ پولیو کا ٹیکہ ہر قسم کی پیچیدگیوں سے محفوظ ہے۔ ڈی۔ پی۔ ٹی کے ٹیکے سے بچے کو ہلکا سا بخار ہوسکتا ہے جو 45 گھنٹہ میں خود بخود ختم ہو جاتا ہے۔ اس بخار میں بچے کو میرول (Majoral) یا بے بی اسپرین کی ٹیکہ دے دینا چاہیے۔ ان ٹکیوں سے بخار اتر جاتا ہے۔ جہاں تک چیچک کے ٹیکے کا تعلق ہے۔ اگر ٹیکے کی جگہ کی نگہداشت نہ کی جائے تو بہت سی پیچیدگیاں پیدا ہوسکتی ہیں حالانکہ قاعدے سے یہ پیچیدگیاں پیدا نہیں ہونا چاہیے۔ ان ٹیکوں کے بعد بخار ہو جاتا ہے اور ٹیکوں میں سرخی اور سوجن پیدا ہو جاتی ہے۔ کبھی کبھی جلد پر چکتے بھی پڑ جاتے ہیں جو ابتدا میں خسرہ کی شکل کے ہوتے ہیں۔ جلد کی کوئی اور بیماری بھی ہوسکتی ہے۔ یہ چکتے جو سرخ رنگ کے ہوتے ہیں خود بخود ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ ایک ایسے بچے میں جو خارش میں مبتلا ہے۔ بدن کے دوسرے حصوں میں ٹیکوں کے سے زخم پیدا ہو جاتے ہیں۔ اسی لیے خارش یا دوسری جلدی بیماریوں کے زمانے میں ٹیکے لگوانا ٹھیک نہیں۔ بعض دوسرے قسم کی پیچیدگیاں بھی پیدا ہوسکتی ہیں لیکن یہ زیادہ عام نہیں ہیں۔ بی۔ سی۔ جی کا ٹیکہ عام طور پر چھ ہفتہ میں ٹھیک ہو جاتا ہے لیکن بعض دفعہ اس کی وجہ سے بغلوں اور جانگھیں میں گلٹیاں نکل آتی ہیں لیکن یہ کوئی تشویشناک بات نہیں ہے۔ لیکن اگر یہ گلٹیاں چھ ہفتہ کے اندر ختم نہ ہوں تو ڈاکٹر کو دکھانا چاہیے۔ اس دوران ٹیکے کی جگہ پر کھرنڈ آ جاتا ہے۔ اگر کھرنڈ کے باوجود ٹیکے سے مواد خارج ہو رہا ہو تو ڈاکٹر کو دکھانا چاہیے۔ لیکن ٹیکے پر کسی قسم کی کوئی دوا یا اور چیز ہرگز نہ لگانا چاہیے۔

چیچک کے ٹیکوں کے ردعمل کے بارے میں کچھ بتائیں کہ ان کی دیکھ بھال کیسے کریں؟

چیچک ٹیکے تیسرے دن سرخ ہو جاتے ہیں۔ پانچویں دن سے ٹیکے اٹھنے لگتے ہیں۔ ساتویں دن وہ ابل سے جاتے ہیں۔ یہ کیفیت اڑتالیس سے بہتر گھنٹہ تک رہتی ہے۔ اس کے بعد یہ پھوٹ جاتے ہیں اور تین ہفتہ میں خشک ہو جاتے ہیں لیکن ان کے داغ باقی رہتے ہیں۔ ٹیکے لگنے کے آٹھویں نویں دن بچے کو ٹیکوں کے زور کی وجہ سے تیز بخار ہو جاتا ہے اور ٹیکے سرخ ہو جاتے ہیں۔ اگر ضروری سمجھیں تو بخار کو کم کرنے کے لیے کوئی دوا دے دیں۔ ویسے دوا دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ ٹیکوں پر کچھ بھی لگایا جائے۔ نہ کوئی پاؤڈر، نہ تیل اور نہ کوئی اور دوا۔ اگر بہت ضروری ہو تو دن میں دو یا تین بار ٹیکوں پر اسپرٹ لگا دیں جس زمانے میں ٹیکوں سے مواد خارج ہو رہا ہو تو ٹیکوں کو صاف کرنے کے لیے صاف روئی استعمال کرنا چاہیے۔

بی۔ سی۔ جی۔ ٹیکہ کتنی مدت میں ٹھیک ہو جاتا ہے؟

بی۔ سی۔ جی کا ٹیکہ الٹے بازو پر اوپر کی طرف لگایا جاتا ہے۔ ٹیکے کا نشان عام طور پر غائب ہو جاتا ہے۔ دو تین ہفتہ تک کوئی ردعمل ظاہر نہیں ہوتا۔ تقریباً تین ہفتہ کے بعد ٹیکے کی جگہ پر ایک چھوٹا سا دانہ سا ابھر آتا ہے۔ یہ داد کچھ دن بعد پک جاتا ہے اور اس میں سے مواد نکلنے لگتا ہے۔ بہر حال دو تین ہفتہ میں یہ ٹھیک ہو جاتا ہے لیکن اس کا نشان باقی رہ جاتا ہے۔ اس دوران بغل میں گلٹیاں نکل آتی ہیں۔ لیکن ٹیکے کا زور ختم ہونے پر خود بخود ٹھیک ہو جاتی ہے۔ بعض بچوں میں یہ گلٹیاں کچھ دیر میں ختم ہو جاتی ہیں۔

بی۔ سی۔ جی کے خراب مظاہر کیا ہوتے ہیں؟

بی۔سی۔جی کا ٹیکہ پک جاتا ہے اور اس میں سے مواد خارج ہونے لگتا ہے اور عام طور پر بارہ ہفتوں میں ٹھیک ہوتا ہے۔ لیکن بعض صورتوں میں اس کے اچھا ہونے میں کبھی کبھی زیادہ وقت بھی لگ سکتا ہے۔

ہوسکتا ہے کہ بعض صورتوں میں بغلوں میں نکلنے والی گلٹیاں جلد ختم نہ ہوں لیکن جب تک یہ ٹھیک نہ ہوجائیں۔ یا پھوڑے کی شکل اختیار نہ کرلیں ان کو قطعاً ہاتھ نہ لگایا جائے کیونکہ اس صورت میں ان کا باقاعدہ علاج کرانا ہوگا اور لگانے اور کھانے دونوں طرح کی دوائیں استعمال کرنا ہوں گی اس لیے جب کبھی ایسی صورت ہوتو فوراً ڈاکٹر سے مشورہ کرنا چاہیے۔

پھنسی اور پھوڑے میں کیا فرق ہے؟

پھنسی سے مراد ایک چھوٹا سا چھالا ہے جس میں شفاف رطوبت بھری ہوتی ہے اس کے برخلاف پھوڑے میں غیر شفاف یا گدلا مواد بھرا ہوتا ہے۔

کیا چیچک کا ٹیکہ اگر پہلی بار میں نہ اٹھے تو دوبارہ لگوانا چاہیے؟

ڈی۔پی۔ٹی کا ٹیکہ کس عمر میں لگوائیں؟

اگر چیچک کا ٹیکہ نہ اٹھے تو اسے ہر چھٹے ہفتہ جس وقت لگواتے رہنا چاہیے جب تک ٹیکے ٹھیک سے نہ اٹھ جائیں اس کے بعد ہر تیسرے سال چیچک کا ٹیکہ لگواتے رہنا چاہیے جیسا کہ میں بتا چکی ہوں D.O.T کا ٹیکہ ایک سال کی عمر کیا دوسری بار اور پانچ سال کی عمر میں تیسری بار لگوانا چاہیے۔ اس کے بعد ہر تیسرے سال D.T کا ٹیکہ لگوانا چاہیے کیونکہ چھ سال بعد D.P.T کا ٹیکہ نہیں لگایا جاتا کیونکہ یہ ٹیکہ خطرناک ثابت ہوسکتا ہے اس لیے D.T ہی لگایا جاتا ہے اور D.T کا اعادہ ہر تیسرے سال اس وقت تک ہونا چاہیے۔ جب تک بچہ پندرہ سال کا نہ ہوجائے۔

کالی کھانسی کا ٹیکہ خطرناک کیوں ہوتا ہے؟

کالی کھانسی کی ویکسین اگر چھ سال کے بعد دی جائے تو ایک لاکھ میں ایک کو دماغی سوزش پیدا ہوسکتی ہے۔ ہم آپ کے بچے کو کسی خطرے میں نہیں ڈال سکتے اسی لیے ہم چھ سال کی عمر کے بعد کالی کھانسی کا ٹیکہ لگوانے کا مشورہ نہیں دیتے۔

پولیو سے بچے کو محفوظ کرنے کے بارے میں کچھ بتائیں؟

پولیو کے قطرے اس عمر میں دینا چاہئیں جس کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں اس کا طریقہ یہ ہے کہ اس کی ویکسین (Vaccine) کے چند قطرے بچے کے منہ میں ٹپکا دیے جاتے ہیں لیکن اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ بچے کو دوا دینے سے آدھا گھنٹہ پہلے اور آدھا گھنٹہ بعد کچھ نہ کھلایا جائے۔ اس بات کا بھی اطمینان کرلینا چاہیے کہ پولیوں کی دوا دیتے وقت بچے کو ڈائریا، سانس کی شکایت، نزلہ زکام نہ ہو ورنہ دوا سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ یہ بھی ضروری ہے کہ یہ دوا کسی باضابطہ تسلیم شدہ مرکز سے حاصل کی جائے ورنہ ہوسکتا ہے کہ آپ کو نقلی یا خراب ویکسین مل جائے جس کے نتائج بعد میں خراب نکل سکتے ہیں۔ اگر دوا ٹھیک طریقہ سے نہ دی جائے تو اس کا اثر نہیں ہوتا۔ اس دوا کو خراب ہونے سے بچانے کے لیے ریفریجریٹر میں ایک خاص درجۂ حرارت پر ٹھنڈا رکھنا پڑتا ہے۔ اکثر مرکزوں میں اس کی سہولت مہیا نہیں ہوتی۔ اس لیے اس بات کا خاص طور پر خیال رکھنا چاہیے کہ دوا وہیں سے حاصل کی جائے جہاں یہ سہولت موجود ہو۔ پولیو کے قطرے پہلے یا زیادہ سے زیادہ بوسٹر کے بعد دینے کی ضرورت نہیں رہتی۔

بچے کو ہیضہ اور میعادی بخار سے کیسے بچائیں؟

بچے کو ٹائیفائڈ کا ٹیکہ ہر سال گرمی شروع ہونے سے پہلے لگوانا چاہیے کیونکہ اس ٹیکے کی میعاد چھ ماہ ہوتی ہے بچوں کو آپ ہر جگہ اور ہر قسم کا پانی پینے سے کہاں تک روک سکتے۔ اگر آپ اسے بوتل میں پانی بھر کر دے دیں تب بھی کوئی فائدہ نہیں ہوگا وہ یا تو یہ پانی دوسرے بچوں کو پلا دے گا یا پھینک دے گا اور دوسرے بچوں کے ساتھ اسکول کے نل سے پانی پیے گا تاکہ اسے کوئی ’’نکّو‘‘ نہ بنا سکے۔ اس کے علاوہ دودھ اور آئس کریم سے بھی ٹائیفاڈ کے جراثیم پھیلتے ہیں۔ بچے آئس کریم کے شوقین ہوتے ہیں۔ اس لیے یہ اچھا ہے کہ انھیں آئس کریم کھانے سے روکنے کے بجائے ٹائیفائڈ کا ٹیکہ لگا دیا جائے۔

ہیضہ کا ٹیکہ بچوں کو لگانا اصولاً صحیح اور مناسب نہیں ہے۔

کیا بی۔سی۔جی کے ٹیکے کا اعادہ بھی ضروری ہے؟

اگر بچے کو بی۔سی۔جی دیا گیا ہے تو ایک سال کی عمر میں اس کی جانچ کرنا چاہیے کہ ٹیکہ کامیاب رہا یا نہیں۔ اس جانچ کو (Mantoux) کہتے ہیں۔ اگر جانچ کا نتیجہ منفی نکلے تو ٹیکہ دوبارہ لگوانا چاہیے۔ اگر نتیجہ مثبت ہے تو ٹیکہ دوبارہ لگانے کی کوئی ضرورت نہیں۔

ایم ایم آر ویکسین کے متعلق کچھ بتائیے؟

ایم ایم آر ویکسین، خسرہ، گلسوے (MUMPS) اور روبیلا یا جرمن میزل سے تحفظ کے لیے ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں صرف خسرہ کی ویکسین ملتی ہے وہ بھی چند جگہوں پر۔ بقیہ دو قسم کی ویکسین ہندوستان میں موجود نہیں ہے۔ بیرونی ممالک میں یہ ویکسین نہ صرف موجود ہے بلکہ بہت ارزاں بھی ہے۔ اسے یہاں استعمال کے لیے درآمد کرنا بھی ممکن نہیں ہے۔ لیکن جب یہ ہمارے ملک میں تیار ہونے لگے تو اسے ضرور استعمال کیا جائے کیونکہ یہ ایک ہی وقت میں بچے کو تین موذی بیماریوں سے محفوظ کر دیتی ہے۔

روبیلا کی بیماری کیا ہے اور یہ حاملہ عورتوں کے لیے کیوں خطرناک ہے؟

روبیلا ایک قسم کا خسرہ ہے لیکن یہ خسرہ کے مقابلہ میں کم شدید ہوتا ہے۔ اس بیماری میں مبتلا شخص کی گردن میں گلٹیاں نکل آتی ہیں جو خسرہ کے مریض کو نہیں نکلتیں اگر کسی چھوٹی بچی کو روبیلا ہو جائے تو پھر وہ ایک لمبے عرصہ تک اس بیماری میں مبتلا نہیں ہوتی لیکن اگر کسی حاملہ عورت کو، خصوصاً حمل کے پہلے تین مہینوں میں، یہ بیماری ہو جائے تو یہ پیٹ کے بچے کو بھی لگ جاتی ہے جس کی وجہ سے ہوسکتا ہے کہ وہ بچہ اندھا پیدا ہو یا اس کے جسم میں کوئی اور عیب پیدا ہو جائے اور اپاہج ہو جائے۔ اسی لیے ہم یہ مشورہ دیتے ہیں کہ روبیلا کا ٹیکہ بچپن ہی میں لگوالینا چاہیے تاکہ بچہ اس مرض سے محفوظ رہ سکے۔ ایسی حاملہ عورت جو بچپن میں روبیلا میں مبتلا رہ چکی ہو یا جس کا ٹیکہ لگ چکا ہو نہ تو حمل کے دوران اس بیماری میں مبتلا ہوگی اور نہ یہ بیماری پیٹ کے بچے کو لگ سکے گی۔

جن بچوں کو پہلے سے ٹیکہ نہ لگا ہو انھیں کس ترتیب سے ٹیکے لگائیں،

اس بچے کے لیے بھی ٹیکوں کی ترتیب وہی ہوگی جو دوسرے ننھے بچوں کے لیے بتائی جا چکی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی چھ برس کا ایسا بچہ ہمارے پاس آئے جس کے کوئی ٹیکہ نہ لگا ہو تو ہم اسے پہلے دن بی۔سی۔جی ڈی۔پی۔ٹی اور پولیو کا ٹیکہ دیں گے اور دو مہینے تک ہر مہینے ایک بار D.P.T اور پولیو کا ٹیکہ لگتا رہے گا۔ اس کے بعد چیچک کا ٹیکہ لگایا جائے گا۔ اگر بچہ چھ سال سے بڑا ہے تو صرف D.T کا ٹیکہ لگایا جائے گا جس کی وجہ سے پہلے ہی بتا چکی ہوں۔ باقی ترتیب ویسی ہی رہے گی۔

کیا ٹیکے بیماریوں سے سو فیصد محفوظ کر دیتے ہیں؟

ہوسکتا ہے کہ ٹیکوں سے بیماریوں سے سو فیصد تحفظ نہ ہوتا ہو لیکن ان میں سے اکثر بیماریوں سے نوے فیصدی تحفظ تو ہو ہی جاتا ہے۔ نوے فیصدی میں نے اس لیے کہا کہ ہوسکتا ہے کہ جب اس کے ٹیکہ لگا ہو تو بیماری کے جراثیم اس کے بدن میں موجود ہوں۔ بہرحال اگر ٹیکہ لگنے کے بعد بیماری ہوتی بھی ہے تو بہت ہلکی ہوتی ہے اور اس کا بچہ کی صحت پر برا اثر نہیں ہوتا۔ اور اگر بچے کے ابتدا ہی میں ٹیکے لگوا دیے جائیں تو بیماری سے سو فیصدی محفوظ رہ سکتا ہے۔ پولیو کے بارے میں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ ٹیکے کے بعد بھی ہو جاتا ہے لیکن یہ غلط ہے۔ اگر ویکسین صحیح ہو اور ٹھیک طریقہ سے دی جائے تو بچے کو پولیو نہیں ہوتا۔ بدقسمتی سے ابھی بعض امراض کے خاتمہ کے لیے کوئی دوا تیار نہیں ہوسکی ہے۔ لیکن جو دوائیں مہیا ہیں ان کے ٹیکے ضرور بچے کو دے دینا چاہئیں۔

(ماخوذ بچے کی صحت، ستیہ گپتا، سنہ اشاعت 2010، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان)

ارتباط

ماہنامہ خواتین دنیاء ماہ ستمبر باصرہ نواز ہوا مضامین کی ادبی چشمک سے آگاہی ہوئی اس شمارے میں بہت ہی دلچسپ مضامین عرق ریزی کے ساتھ مع دیدہ زیب رنگوں کے ساتھ ترتیب دیئے گئے ہیں وہ تمام اسٹاف قابل مبارکباد ہیں جنکی کاوشوں سے خصوصی ترتیب وتزین سے دلچسپ نت نئے دیدہ زیب رنگوں کے ساتھ منفرد انداز میں قارئین اُردو ادب کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے خواتین دنیا پیش نظر شمارہ میں ڈاکٹر لیاقت علی صاحب کا مضمون تعلیم نسواں کے فروغ میں ساوتری بائی پھلے اور فاطمہ شیخ کے کردار پر خواتین کے حقوق اور ترقی میں تاریخ کے حوالہ کے ساتھ معہ اقتباسات مدلل بات کی گئی ہے جو کہ عزم حوصلہ کو دعوت دیتی ہے ڈاکٹر فاطمہ خاتون صاحبہ کے مضمون جہاں نسواں سے باقی احمد پوری کا شعری جہاں پر تحقیقی وتنقیدی مساعی کے ساتھ عطر کشید کیا ہے منتخبہ اشعار اور ندرت تخیل اور مختلف حوالوں کے ساتھ پیش کیا ہے اسی طرح سے ڈاکٹر سریتا چوہان کے مضمون نیر مسعود اور دھول بن کا غبار بہت پسند آیا ہے اور ڈاکٹر علیم اللہ صاحب کے مضمون نسوانی کردار کا رمز شناس راجندر سنگھ بیدی پر اختصار کے ساتھ روشنی ڈالی گئی جسمیں بیدی کو نفسیات کے ماہر نباض کے طور پر بہترین پیرائے اظہار میں معہ اقتباسات کے ساتھ پیش کیا گیا ہے اس کے علاوہ کنیز فاطمہ صاحبہ کے مضمون ”عورت کا مشرقی تصور اور ناول“ ایک اور کوسی 'تانیثی تحریک' کے حوالہ کے ساتھ مدلل اختصار کے ساتھ دانش اور صابر انم کے منفرد کردار کے حوالے سے ناول پر بات کی گئی ہے جو کہ بہت معلوماتی ہے غزل کے بدلتے رجحانات پر منزہ قیوم صاحبہ نے دلکش انداز میں الفاظ کے دروبست منفرد انداز اسلوب علمی جولانیت اور مدرک نگاہ کے ساتھ تحقیقی وتنقیدی بصیرت سے روشن طبع کے جوہر دکھانے میں تحقیقی مساعی کی ہے جو کہ مختلف ادوار کے شعرا پر مستعمل ہے اپنے کشف المحجوب مطالعہ سے غزل کے بدلتے رجحانات سے عطر کشید کیا ہے۔

جینے کی حدیں ملتی ہیں تمہیں ، ایمائے اجل ہے آگے بڑھ
منزل کا نشاں ہے ہر منزل ، آرام کسی منزل میں نہیں

ڈاکٹر شہباز زریں جلیل احمد خان کے مضمون کہانیوں سے خوف اگلتی وہ رات بہت پسند آئی اور گن فیکون ہیں فوزیہ حبیب صاحبہ نے خدا تعالی کی نعمتوں کا شکر ادا کرتے ہوئے کن فیکون پیش کیا گیا ہے جو بہت دلچسپ ہے اسی طرح سے شاعرات کے منتخب اشعار بہت دلچسپ لگے ہیں خوشبو پروین صاحبہ کے مضمون بھاگلپور کے رباعی گو شعرا تحقیقی و تنقیدی بصیرت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے شائستہ فاخری کے افسانوں میں نسوانی حسیت پر پرویز احمد صاحب نے علمی جولانیت کے ساتھ ندرت تخیل سے فنکارانہ پیش کش کی ہے جو کہ قابل تعریف ہے۔ رفعت شاہین صاحبہ نے مضمون اقبال حسن آزاد معتبر ومنفرد افسانہ نگار پر تخلیقیت کے رموز کے ساتھ دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے تمام غزلیں بھی بہت معیاری ہیں الفاظ کا انتخاب ولفظوں کی حرمت گفتگو میں حلاوت موزونیت کے ساتھ پیش ہے۔ ڈاکٹر بشریٰ اشرف صاحبہ نے بچوں کی بیماری اور طریقہ علاج پر بہت ہی دلچسپ معلومات کے ساتھ نفسیاتی پہلوؤں کی عکاسی کرتے ہوئے علاج و معالجہ احتیاطی تدابیر پر مفصل پیرائے میں اظہار کیا ہے جو قابل ستائش ہے۔

محمد ارشد علی، ضلع نرمل ریاست تلنگانہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ماہنامہ خواتین دنیا، ستمبر: ایک مطالعہ

ماہنامہ خواتین دنیا کا شمارہ ستمبر 2024 بفضلہ تعالی موصول ہوا پڑھ کر محسوس ہوا کہ جس ہستی کو معاشرے میں حقیر سمجھا جاتا ہے جس کی پیدائش پر لوگ رحمت نہ سمجھ کر زحمت سمجھتے ہیں بالکل اسی شخصیت کے فروغ کے لیے کوساں رسالہ خواتین دنیا ہے۔

اس شمارے کو بھی دیگر اداریہ کی طرح ہی منفرد وانوکھے انداز میں پیش کیا گیا ہے "مشعل" میں مدیر شمس اقبال صاحب نے پانچ ستمبر اور اساتذہ کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ:-

" طلبہ کی شخصیت اور کردار سازی میں استاد کا رول بہت اہم ہے"

اور پھر جہان نسواں کے گوشے میں شامل مضامین قابل غور ہے۔ اس گوشے کے مطالعے سے تعلیم میں نسواں باقی احمد پوری کا شعری جہاں، نیر مسعود اور، دھول بن، کا غبار نسوانی کردار کا رمز شناس راجندر سنگھ بیدی، عورت کا مشرقی تصور، اور ناول ایک اور کوسی، ،غزل کے بدلتے رجحانات، اقبال حسن آزاد: ایک منفرد افسانہ نگار، شائستہ فاخری کے افسانوں میں نسوانی حیثیت، بھاگل پور کے رباعی گو شعرا کو پڑھنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ گوشۂ نکہت سخن میں پیش کردہ شاعرات کے منتخب اشعار پڑھ کر مختلف پھولوں کی خوشبو محسوس ہوئی۔

گوشہ افسانہ میں ڈاکٹر شہباز زرین جبیل احمد خان کا خوبصورت افسانہ پیش کیا گیا ہے اور کن فیکون کے عنوان سے فوزیہ حبیب کا فسانہ بھی قابل مطالعہ ہے

"حسن سخن" میں نازیہ افروز، محترمہ فوزیہ اختر ردا صاحبہ، عائشہ دولت صاحبہ کی دلفریب غزلیں موجود ہیں جن کو پڑھ کر دل باغ باغ ہوجاتا ہے بطور خاص فوزیہ فوزیہ اختر ردا کی غزل عمدہ اور قابل اقتباس ہے:-

دل نے چھوڑا نہیں ہر بار بھروسہ کرنا
دل یہ سمجھے گا بھلا کیسے کہ دنیا کیا ہے

ذات جب ہوگئی منسوب فقط اس سے ہی
پھر ردا چوڑیاں، گجرا ، میرا گہنا کیا ہے

ہر کوئی جان نہیں سکتا حقیقت کو کبھی
جگنوؤں کو یہ پتہ ہے کہ سویرا کیا ہے

اسی طرح نازیہ افروز کا یہ شعر بہت ہی متاثر کن ہے:

مشغول ہے دل میری نفی میں
جیسے کہ خیال خام ہوں میں

اڑنے لگے آرزو کے پنچھی
جس روز سے زیر دام ہوں میں

اور عائشہ دولت کی نظم ''تم ہی تم'' بہت ہی خوبصورت اور قابل دید نظم ہے۔

گوشۂ صحت ڈاکٹر بشری اشرف نے کمال کی تحریر پیش کی ہے جس سے سو فیصد بچوں کے صحت کو درست رکھا جا سکتا ہے۔ قارئین کے خطوط میں ترنم پروین جامعہ نگر اوکھلا نئی دہلی کا مراسلہ موجود ہے جو کم لفظوں میں جامع باتیں کہہ دینے کا فن رکھتی ہیں۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ رسالہ خواتین دنیا لائق مطالعہ اور قابل تحسین ہے۔

رقیہ مظفرپوری، شعبۂ اردو، نتیشور کالج، مظفرپور (بہار)

مطبوعات نسواں

آئندہ شمارے سے خواتین دنیا میں مطبوعات نسواں کے عنوان سے ایک نیا کالم شروع کیا جا رہا ہے جس میں خواتین کی کتابوں پر تبصرے اور تجزیے شائع کیے جائیں گے۔

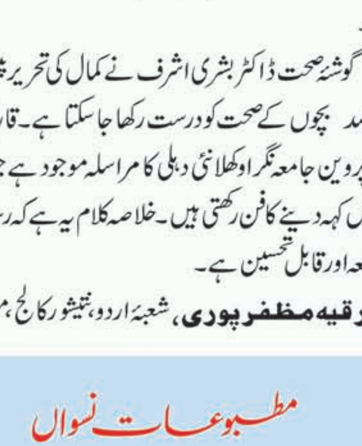

خواتین اپنی تازہ مطبوعات درج ذیل پتے پر ارسال فرمائیں۔

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا
جسولہ، نئی دہلی-110025، فون: 49539000
ای میل: kduniya@ncpul.in
editor@ncpul.in

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

دکنی ہندو اور اردو

مصنف: نصیر الدین ہاشمی

تیسری اشاعت: 2023

صفحات: 266

قیمت: 170 روپے

کلیاتِ فراق (جلد سوم)

ترتیب وتدوین: کالی داس گپتا رضا

پہلی اشاعت: 2023

صفحات: 399

قیمت: 235 روپے

املا نامہ

مرتب: گوپی چند نارنگ

چوتھی اشاعت: 2023

صفحات: 97

قیمت: 80 روپے

جدید ہندوستان میں ذات پات اور دوسرے مضامین

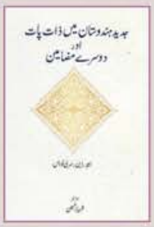

مصنف: ایم این سری نواس

مترجم: شہباز حسین

دوسری اشاعت: 2023

صفحات: 180، قیمت: 125 روپے

قدیم لکھنؤ کی آخری بہار

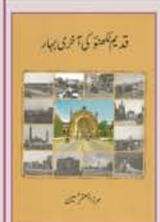

مصنف: مرزا جعفر حسین

دوسری طباعت: 2023

صفحات: 671

قیمت: 355 روپے

حالی کا سیاسی شعور

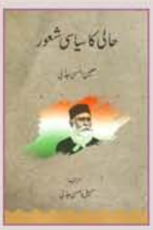

مصنف: معین احسن جذبی

مرتب: سہیل احسن جذبی

دوسری طباعت: 2023

صفحات: 164، قیمت: 215 روپے

حالی کی غزلیں اور قطعات

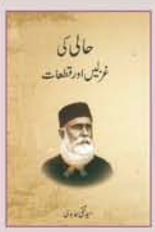

مرتب: سید تقی عابدی

پہلی اشاعت: 2023

صفحات: 66+185

قیمت: 150 روپے

نوم چامسکی

مصنف: علی رفاد فتیحی

پہلی اشاعت: 2023

صفحات: 54

قیمت: 70 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: books@ncpul.in

माहनामा ख्वातीन दुनिया मासिक, नवम्बर-२०२४ वर्ष: ८, अंक: ११
Mahnama Khawateen Duniya Monthly November 2024 ,Vol. 8, Issue:11
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education , Department of Higher Education, Government of India

RNI. No. DELURD/2017/74026
DL (S)-17/3555/2024-26
ISSN 2581-4826
Date of Publication: 13-11 -2024
Date of Dispatch : 14 and 15 of every month
Total Pages: 64

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

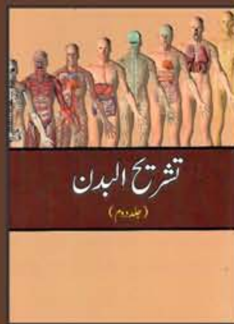

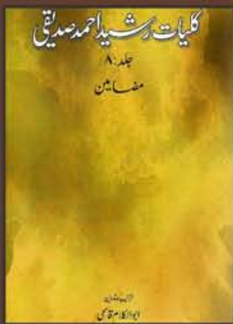

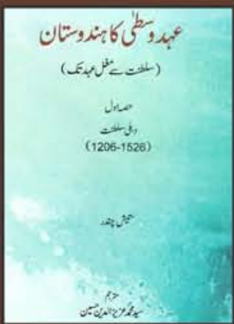

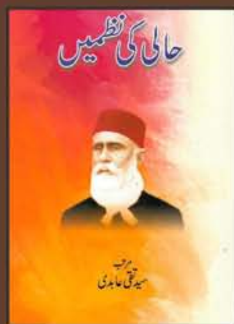

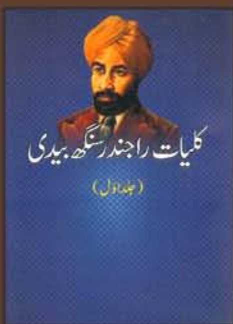

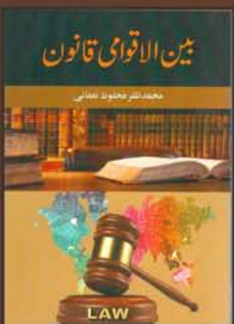

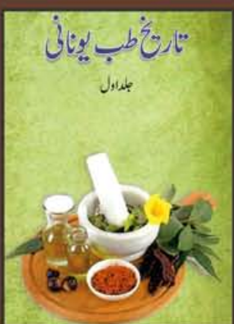

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.: sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Md. Shams Equbal, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at Makoff Printers, B-127, Sector 65, Noida-201301 (U.P)
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025